یاد کیجیے

ہمارے رہنما

(7)

مترجم : فرحت قمر

چلڈرن بک ٹرسٹ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان بچوں کا ادبی ٹرسٹ

مہادیو گووند راناڈے

پردین بھیم سین

مسٹر راناڈے ان لوگوں میں سے تھے جو مختلف ملکوں میں کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں اور بھٹکے ہوئے کمزور انسانوں کو راستہ دکھانے کے لیے روشنی کا کام کرتے ہیں۔ راناڈے ایک ایسے انسان تھے جن کی زندگی کا ایک مشن ہوتا ہے، جو انسانیت کو ایک نیا سبق پڑھاتے ہیں، انسانوں کے خیالات کو ایک نئی تحریک دیتے ہیں اور دلوں میں نئی امید کی روح پھونک دیتے ہیں۔ راناڈے کا مقصد تھا کہ وہ سمجھائیں کہ ان کے مشن سے ہم کو نئے مواقع میسر آئیں گے، ساتھ ہی ساتھ ہمارے کندھوں پر کچھ ذمہ داریاں بھی آئیں گی اور اگر ہم نے ان ذمہ داریوں کو پورا کیا تو یقیناً ہمیں اس مشن سے بہت سے فائدے حاصل ہوں گے۔

گوپال کرشن گوکھلے

مہادیو گووند راناڈے

انیسویں صدی کے پہلے پچاس سالوں میں راجہ رام موہن رائے اور ایشور چند ودّیا ساگر جیسے رہنما پیدا ہوئے۔ جنھوں نے ہندوستانی سماج سے ستی اور بچپن کی شادی کی جیسی برائیوں کو ختم کرنے کے لیے جی جان سے کوشش کی۔ اس کام کی ابتدا بنگال سے ہوئی تھی۔

انیسویں صدی کے آخری پچاس سالوں میں سماج میں آنے والی تبدیلیوں کی یہ لہر مغربی ہندوستان میں بھی پھیل گئی۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے کئی رہنما میدان میں آئے۔ مہاراشٹر میں ہندوستان کا ایک عظیم سپوت پیدا ہوا جس کا نام مہادیو گووند راناڈے تھا۔ راناڈے، بال شاستری جمبھے کر اور گوپال ہری دیش مکھ جیسے عظیم سماج سدھار رہنماؤں سے بہت متاثر ہوئے اور خود بھی اپنے زمانے کے ایک سرگرم مصلح بن گئے۔

راناڈے صرف ایک مصلح یا سماجی کام کرنے والے ہی نہیں تھے بلکہ انھوں نے ہندوستان کی ہر طرح کی ترقی اور ہندوستانی زندگی میں ایک نیا رنگ بھرنے کے لیے بھی کام کیا۔ اگر ہم ان کے خیالات کو سمجھ لیں تو ان کے کاموں کو بھی بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ ان کا یقین تھا کہ ترقی ہر طرف یا ہمہ جہت ہوتی ہے ورنہ بالکل نہیں ہوتی۔ وہ پوری طرح اس بات کو مانتے تھے کہ سماج میں سدھار لائے بنا ترقی کرنا ناممکن ہے۔ ترقی کے بارے میں ان کا نظریہ یہ تھا کہ ترقی زندگی کے تمام پہلوؤں میں ہونی چاہیے۔

بچپن

مہادیو گووند راناڈے 18 / جنوری 1842 کو مہاراشٹر کے ناسک ضلع میں قصبہ پنھاڈ میں پیدا

ہوئے۔ ان کے والد گووند راناڈے انگریزی سرکار کی ملازمت میں تھے۔ جس وقت مہادیو پیدا ہوئے تو وہ پنھاڈ میں سرکاری کلرک تھے۔ بعد میں وہ ریاست کولہاپور کے "کار بھاری" کے دفتر میں کورٹ ریڈر ہوگئے۔

راناڈے کچھ خاموش طبیعت کے بچے تھے۔ ان کے چہرے سے کبھی جوش یا بے چینی کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ جب ان کی عمر صرف تین سال کی تھی تو ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے ان کی طبیعت کا اطمینان اور سکون پوری طرح ظاہر ہوگیا۔ اگر کوئی اور بچہ ہوتا تو اس موقع پر گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانے لگتا۔

راناڈے کی ماں کا نام گوپیکا بائی تھا۔ وہ 1845 میں اپنی کچھ دن کی بچی درگا اور اپنے بیٹے مہادیو کے ساتھ اپنے شوہر کے پاس کولہاپور جارہی تھیں۔ بیل گاڑی کا لمبا سفر تھا۔ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے یہ لوگ تھک گئے اور سوگئے۔ مہادیو ایک کمبل میں لپٹے ہوئے تھے۔ راستہ میں وہ بیل گاڑی سے گر گئے اور کسی کو اس بات کا پتہ بھی نہیں چلا۔ وہ چپ چاپ سڑک پر اسی حالت میں پڑے رہے۔ کچھ دیر بعد ان کے چچا جو پیچھے گھوڑے پر آرہے تھے۔ وہاں سے گزرے تو انھوں نے بھی انھیں نہیں دیکھا۔ آخر چچا کو دیکھ کر کمبل میں لپٹے مہادیو نے ہی اپنی باریک سے آواز میں پکارا "چاچا بادھو میں یہاں پڑا ہوں"۔

راناڈے کی خاموش طبیعت سے گھر والوں کو یہ خیال ہونے لگا کہ یہ لڑکا کند ذہن ہے۔ ان کی ماں کو یہ فکر رہتی تھی کہ وہ بڑا ہو کر چار پیسے کما کر گھر والوں کی مدد بھی کر سکے گا یا نہیں۔ امتحان میں پاس ہونے جیسی خوشخبری پاکر بھی راناڈے کوئی خاص خوشی یا جوش کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ بلکہ کبھی کبھی وہ یہ سوال پوچھتے ضرور دکھائی دیتے تھے کہ "امتحان پاس کرلینا کون سی خاص بات ہے؟ ہم سال بھر پڑھائی کرتے ہیں تو یہ قدرتی بات ہے کہ پاس ہوجاتے ہیں۔" ان کا یہ رویہ جو شرمیلے پن کی حدوں کو چھو لیتا تھا ان کی زندگی کا ایک حصہ بن گیا تھا۔

چھ سال کی عمر میں انھیں کولہاپور کے مراٹھی اسکول میں داخل کرادیا گیا۔ پھر 1851 میں جب ان کی عمر نو سال ہوئی تو انھیں ایک انگلش اسکول میں بھیج دیا گیا۔ جب انھوں نے کولہاپور کے اسکول کی تعلیم پوری کرلی تو 1857 کے شروع میں انھیں بمبئی کے ایک اسکول میں

داخل کرادیا گیا۔ اس اسکول کا نام ایلفنسٹن انسٹی ٹیوشن تھا۔ بمبئی کے گورنر ماؤنٹ اسٹورات ایلفنسٹن نے 1824 میں اس اسکول کو شروع کیا تھا اور یہ اپنی طرز کا پہلا اسکول تھا، جس کا مقصد بچوں کو ایسی تعلیم دینا تھا جو وسیع ہو، پوری طرح منظم ہو، اور دوسرے مضامین کے ساتھ ساتھ سائنس بھی پڑھائی جائے۔ حالاں کہ راناڈے کے والد پرانے خیالات کے آدمی تھی لیکن انگریزی تعلیم کے فائدوں کو وہ اچھی طرح سمجھتے تھے۔

راناڈے نے اپنے والد کی امیدوں کو پورا کر دکھایا۔ ایلفنسن اسکول میں ان کی کارکردگی اتنی اچھی رہی کہ ایک سال میں ہی ان کو بمبئی کے ایلفنسٹن کالج میں داخلہ مل گیا۔ راناڈے صحیح معنوں میں طالب علم تھے۔ انتہائی توجہ کے ساتھ وہ گھنٹوں پڑھتے رہتے تھے۔ نہ کسی سے ملتے جلتے نہ آرام کے لیے پڑھائی چھوڑتے۔ جب وہ پڑھائی میں مگن ہوتے تو ان کو یہ بھی پتہ نہ چلتا کہ آس پاس کیا ہو رہا ہے۔ ادب، تاریخ، اکنامکس (معاشیات) اور ڈرامہ کے بڑے بڑے ماہروں کی عظیم کتابیں انھوں نے کھنگال ڈالیں۔ ان کتابوں میں آدم اسمتھ کی ویلتھ آف نیشنز (Wealth of Natiions) گبن کی ہسٹری آف روم (History of Rome) میکالے کی ہسٹری آف انگلینڈ (History of England) شیکسپیئر کی تمام تصانیف، ملٹن کی "پیراڈائزلوسٹ" (Paradise Lost) اور والٹر اسکاٹ کی "لے آف دی لاسٹ منسٹرل" (Lay of the last Minstrel) کے علاوہ اور بہت سی کتابیں شامل تھیں۔

راناڈے کے لیے امتحان پاس کرنا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ جب 1859 میں بمبئی میں پہلی بار میٹریکولیشن کا امتحان ہوا تو اس میں صرف اکیس طالب علم شامل ہوئے تھے اور راناڈے ان میں سے ایک تھے۔ 1862 میں انھوں نے بی۔ اے آنرس کیا، 1864 میں ایم۔ اے اور ایل۔ ایل۔ بی کے امتحانات دیے اور 1865 میں ایل۔ ایل۔ بی آنرس کیا۔ ان سارے امتحانوں میں، تمام مضامین میں ان کو امتیازی نمبر ملے اور اپنی تعلیم کے تقریباً سارے عرصہ میں ان کو وظیفہ بھی ملتا رہا۔

زندگی کے مختلف پہلو

راناڈے کی پرورش خاصے مذہبی ماحول میں ہوئی تھی۔ ہر صبح وہ تکارام، رام داس اور نام دیو

جیسے مراٹھا سنتوں کے بھجن گا کر اپنے دن کی شروعات کرتے تھے۔ اکثر بھجن گاتے گاتے وہ اتنے جذباتی ہو جاتے تھے کہ ان کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگتے تھے۔

راناڈے نے ویدوں اور ہندو مذہب کی دوسری کتابوں کا گہرا مطالعہ کیا۔ انھوں نے دوسرے مذہبوں اور خاص طور پر عیسائیت کا بھی مطالعہ کیا۔ اپنے وسیع مطالعہ کے بعد انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ہندو مذہب کو اور زیادہ سوجھ بوجھ کے ساتھ عقل کی بنیادوں پر سمجھنے کی ضرورت ہے۔

راناڈے کوئی نیا مذہب، تلاش کرنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ تو یہ چاہتے تھے کہ مجموعی طور پر ہندوؤں کے عقیدوں اور رسم ورواج میں اصلاح ہو جائے۔ ان کی خواہش تھی کہ ہندو مذہب میں وہ پاکیزگی اور روحانیت پھر سے لوٹ آئے جو شروع شروع میں اس کی بنیاد تھی۔ جب پرارتھنا سماج نے ہر ہفتے اپنی باقاعدہ 'پرارتھنا سبھائیں' شروع کیں تو راناڈے بڑی پابندی سے ان میں شریک ہونے لگے۔ اتنا ہی نہیں وہ خود بھی ہفتہ واری پرارتھنا کرانے لگے۔ گوپال کرشن گوکھلے کہا کرتے تھے کہ راناڈے کی مذہبی تقریروں سے بہتر تقریریں انھوں نے زندگی میں اور کہیں نہیں سنیں۔ ان کی تقریر سن کر سننے والا اپنے دکھ بھول جاتا تھا۔ ان کی بیوی رما بائی لکھتی ہیں کہ ''کبھی کبھی تو ہمیں ایک سچی روحانی مسرت کا احساس ہونے لگتا تھا...... اعلیٰ قسم کے وہ روحانی تصورات اور خیالات جو ان کی تقریروں سے ابھرتے تھے کافی عرصے بعد تک ہمارے دماغوں میں بسے رہتے تھے۔'' راناڈے کی مذہبی تقریریں ایک ناتھ، تکارام، نام دیو اور رام داس جیسے سنتوں کے خیالات اور بھگودگیتا، اپنشد اور بائبل جیسی کتابوں کی تعلیمات کے مطابق ہوتی تھیں۔

راناڈے ایک خدا کی ذات میں پکا یقین رکھتے تھے اور اسی کو وہ سب سے بڑا حاکم سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انسان خدا کے بس میں بالکل اسی طرح ہوتا ہے جیسے کمہار کے ہاتھ میں مٹی! ہاں انسان اور دوسرے جانداروں میں بس اتنا فرق ضرور ہوتا ہے کہ انسان کو اپنے معاملات میں کسی حد تک آزادی دی گئی ہے اور وہ اپنے کاموں کے لیے خود ذمہ دار ہے۔

اپنے مذہبی جھکاؤ کی وجہ سے راناڈے کے مزاج میں ایک خاص طرح کی نرمی اور رحم کا جذبہ

پیدا ہو گیا تھا۔ ان ہی خوبیوں کی دین وہ تحریک تھی جس سے ہندوستان کی آزادی کے لیے راہ ہموار ہوئی۔ راناڈے ایک سیدھے سادے انسان تھے۔ اور ظاہری ٹیپ ٹاپ میں یقین نہیں رکھتے تھے۔ نہ ہی وہ کبھی دوسروں پر چھا جانے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کا ڈیل ڈول کافی بڑا تھا۔ لیکن ان کی شکل صورت معمولی تھی۔ ناک چھوٹی اور پیشانی بہت چوڑی تھی۔ ان کی آنکھوں میں اکثر تکلیف رہتی تھی اور وہ ذرا اونچا بھی سنتے تھے۔ لیکن ان جسمانی کمزوریوں کے باوجود وہ ایک ممتاز شخصیت کے مالک تھے۔ بہر طور ایک عام انسان کے مقابلہ میں ان میں کہیں زیادہ خوبیاں نظر آتی تھیں۔

ان کے سوچنے کا انداز بہت صاف اور واضح تھا۔ گوپال کرشن گوکھلے ان کے بارے میں لکھتے ہیں "سارے ملک میں بکھرے ہوئے بہت سے نوجوانوں کے لیے راناڈے ایک ایسے سورج کی سی حیثیت رکھتے تھے جس سے ان کی زندگی میں روشنی اور گرمی ملتی تھی۔"

راناڈے غریب طالب علموں کی مدد کرتے تھے اور اپنے نوکروں کا اچھے برے وقت میں پورا پورا دھیان رکھتے تھے۔ لائبریریوں اور علمی اداروں کو وہ دل کھول کر پیسہ دیتے تھے۔ ایک مصلح کی حیثیت سے کبھی کبھی ان پر نکتہ چینی بھی کی جاتی تھی لیکن وہ اسے صبر کے ساتھ برداشت کرتے تھے اور اپنے دل میں کسی سے کدورت نہیں رکھتے تھے۔

ان کا مزاج ہی کچھ ایسا تھا کہ وہ دوسروں کی غلطیوں کو معاف کر دیتے تھے۔ اس کی ایک روشن مثال تو وہی واقعہ ہے جب ایک آئی۔ سی۔ ایس افسر نے فرسٹ کلاس ڈبے سے ان کا سامان باہر پھینک دیا تھا۔ اگر راناڈے چاہتے تو اس افسر کو سزا دلوا سکتے تھے لیکن انھوں نے اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ ان کی نظر میں یہ لڑنے جھگڑنے والی کوئی بات ہی نہیں تھی۔

یوں تو وہ بڑی سنجیدگی سے ہر وقت مصروف رہتے تھے، لیکن اپنے گھر والوں کے لیے وقت ضرور نکال لیا کرتے تھے۔ ان کا اپنا کوئی بچہ نہیں تھا لیکن وہ اپنے بھتیجے بھتیجیوں کے ساتھ خوب کھیلتے اور ان سے ہنسی مذاق بھی کر لیتے تھے۔

عوامی زندگی

راناڈے نے جس قسم کی تعلیم حاصل کی تھی اس کا اثر ان کی زندگی پر بہت گہرا پڑا۔ ایلفنسٹن

انسٹی ٹیوٹ ایک ایسی جگہ تھی جہاں ہندوستانی اور مغربی نظریات اور کلچر کا سنگم ہوتا تھا۔ وہاں رہ کر طالب علم نئے نئے سماجی، معاشی، سیاسی اور مذہبی خیالات سے واقفیت حاصل کرتے تھے۔ انتہائی ذہین، قابل اور صحیح معنوں میں اچھے استادوں کی رہنمائی میں راناڈے کے دل میں سماجی اصلاح کے خیالات پیدا ہوئے اور جلد ہی یہ خیالات مختلف طریقوں سے ظاہر بھی ہونے لگے۔

راناڈے اپنے کالج کے زمانہ میں ہی 'دنیان پرسارک سبھا' میں شامل ہو گئے تھے۔ ایلفنسٹن کالج کے طلباء نے یہ انجمن 1848 میں شروع کی تھی جو کالج کی ادبی اور سائنسی سوسائٹی کے تحت کام کرتی تھی۔ اس انجمن کا مقصد تعلیم کو عام کرنا تھا۔ اس انجمن کے ممبران میں بالکل منگیش واگلے جیسے ممتاز شخص بھی شامل تھے۔ وہ بمبئی کے سب سے بڑے وکیل تھے۔ 1867 میں رام کرشن بھنڈارکر نے واگلے کے ساتھ مل کر ایک مذہبی اصلاحی فرقہ کی بنیاد ڈالی تھی جس کا نام "پرارتھنا سماج" تھا۔ اس میں وامن آباجی مودک جو ایک ممتاز ہیڈ ماسٹر تھے اور جنھوں نے 1871 میں پرارتھنا سماج کی ایک شاخ پونا میں قائم کی ان افراد کے علاوہ اور بھی بہت سے بڑے بڑے لوگ اس سبھا کے ممبر تھے۔

اُن پرجوش اور سرگرم افراد سے متاثر ہو کر راناڈے نے 'دنیان سارک سبھا' میں اپنے مضامین پڑھنے شروع کر دیے۔ ان مضامین کا تعلق سماجی اور معاشی مسئلوں سے ہوتا تھا۔ 1859 میں ہی انھوں نے "تعلیم یافتہ نوجوانوں کے فرائض" کے عنوان سے ایک تقریر کی۔ 1860 میں انھوں نے "مراٹھا راجے' جاگردار اور انعام دار" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ اس مضمون میں انھوں نے ان لوگوں کی عیش پرستی کی زندگی پر نکتہ چینی کی تھی اور ان کو تنبیہ کی تھی کہ اگر انھوں نے اچھی تعلیم حاصل نہیں کی تو ان کا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ 1862 میں جب راناڈے بی۔ اے کر رہے تھے تو وہ ایک انگلش مراٹھی اخبار "اندو پرکاش" کے انگریزی حصہ کے ایڈیٹر بنا دیے گئے۔ اس اخبار کو 1862 کے شروع میں ایک سرگرم سماجی مصلح 'لوک ہت وادی' گوپال ہری دیشِ مکھ نے شروع کیا تھا۔

راناڈے "ودھوا دواہ اُتیجکا منڈلی" میں شامل ہو گئے۔ یہ سوسائٹی بیواؤں کی شادی کے لیے

لوگوں کی ہمت افزائی کرتی تھی۔ 1845 میں اس سوسائٹی کو وشنو شاستری نے شروع کیا تھا۔ وہ انگریزی اور سنسکرت کے ایک بڑے عالم تھے۔ انھوں نے کئی برس انگریزی سرکار کی ملازمت بھی کی تھی۔ راناڈے نے پرارتھنا سماج میں بھی دل چسپی لی جس کا مقصد سماج سدھار تھا۔ انھوں نے اس بات کا عہد کیا کہ وہ اس سماج کے مقصد کو پورا کرنے کے لیے اپنی ساری زندگی لگادیں گے۔ پرارتھنا سماج کے کاموں میں آگے چل کر جو ترقی ہوئی اس میں زیادہ تر راناڈے کی کوششوں کا ہاتھ تھا۔

اس طرح وہ عوامی زندگی میں شامل ہوگئے۔ بنیادی طور پر عوامی زندگی میں ان کی حیثیت ایک سماجی مصلح کی تھی۔ اصلاح کا کام تیزی سے ہونے لگا۔ راناڈے اس کام میں پوری طرح شریک تھے۔ ان کا خاص مقصد لوگوں کے دماغوں میں یہ بیداری پیدا کرنا تھا کہ سبھی لوگوں کے مسئلے ایک جیسے ہیں اور سب مل کر ہی ان کو حل کر سکتے ہیں۔ عوام کو اپنے بارے میں خود ہی سوچنا چاہیے۔ یہ کام حکومت کے لیے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اس طرح انھوں نے عوام میں قومی مفاد اور وطن سے محبت کے جذبات بیدار کیے۔

وکالت کا پیشہ

ایل۔ ایل۔ بی آنرس پاس کرنے کے بعد راناڈے نے خود وکالت شروع کرنے کی بجائے سرکاری ملازمت میں آنے کا فیصلہ کیا۔ اُن کا خیال تھا کہ وکالت کرنے سے ان کی مصروفیت بہت بڑھ جائے گی اور ان کو اپنے سماج سدھار کے منصوبوں کو پورا کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔

اسی بات کو سامنے رکھتے ہوئے انھوں نے بمبئی سرکار کے محکمہ تعلیم میں مراٹھی مترجم کی حیثیت سے 1866 میں ملازمت کرلی۔ ان کے کاموں میں یہ بات بھی شامل تھی کہ وہ مراٹھی ادب میں نئی کتابوں کی اشاعت کی اطلاع بھی سرکار کو دیں۔ اس بات سے انھیں مراٹھی ادب اور مراٹھی زبان کو فروغ دینے میں کافی مدد ملی۔

1867 میں چند مہینوں کے لیے انھیں ریاست اکال کوٹ میں 'کاربھاری' کا عہدہ دیا گیا۔ لیکن ان کی اصل دل چسپی وکالت میں تھی۔ اس لیے جب ریاست کولہاپور میں ان کو نیائے

دھیش (جج) بننے کا موقع ملا تو انھوں نے اس عہدے کو ستمبر کے مہینے میں قبول کرلیا۔ اگلے سال وہ بمبئی لوٹ آئے اور ایلفنسٹن کالج میں انگریزی ادب اور تاریخ کے پروفیسر ہوگئے۔ 1871 تک انھوں نے اس کالج میں پڑھایا۔ اس دوران انھوں نے چھوٹے معاملات کی عدالت میں جج، پولیس مجسٹریٹ اور ہائی کورٹ ڈپٹی کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ وکالت کے بڑے امتحان ایڈوکیٹ ایکزامنیشن کے لیے بھی تیاری کرتے رہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قانون کے میدان میں وہ اعلیٰ تعلیم پوری کرنا چاہتے تھے۔ 1871 میں انھوں نے یہ امتحان پاس کیا اور جلد ہی بمبئی میں انھیں مجسٹریٹ بنادیا گیا۔ اس طرح ایلفنسٹن کالج سے ان کا چودہ سال پرانا تعلق ٹوٹ گیا۔

نومبر 1871 میں انھوں نے بمبئی چھوڑ دی اور پونا میں ایکٹنگ سب آرڈی نیٹ جج (Acting Sbuordinate judge) کی حیثیت سے کام کرنا شروع کردیا۔ ان کے قانونی پیشے کی ابتدا میں ہی اتنا اہم عہدہ مل جانا ایک بڑی بات تھی۔ 1878 تک وہ اسی حیثیت سے کام کرتے رہے۔

'سارو جنک سبھا' کے کاموں میں بھی راناڈے سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔ اس سبھا کو 1870 میں جی۔ ڈبلیو۔ جوشی نے شروع کیا تھا۔ راناڈے اس سبھا کے روح رواں بن گئے۔ اور انھوں نے سماجی، معاشی اور سیاسی مسائل پر مضامین لکھ کر عوام میں ایک بیداری کی لہر پیدا کردی۔

انگریزی سرکار نے 'سارو جنک سبھا' کو ایک باغی سوسائٹی قرار دیا۔ لیکن اس بات سے راناڈے کے کاموں میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑی کیوں کہ وہ حکومت کے خلاف کوئی بھی کام نہیں کرتے تھے۔ پھر بھی سرکار نے 1878 میں ان کا تبادلہ پونا سے ناسک کردیا۔

اس تبادلہ سے راناڈے اپنا کام کرنے سے رکے نہیں اور 'سارو جنک سبھا' کو برابر مشورے دیتے رہے۔ حکومت کو اس بات کا شک ہوا کہ راناڈے کا کچھ تعلق واسودیو بلونت پھڈ کے سے ہے۔ پھڈ کے ایک پرجوش باغی تھا اور امیر لوگوں کو لوٹ کر پیسہ جمع کیا کرتا تھا۔ مئی 1879 میں جب پونا میں دو یادگار عمارتوں میں آگ لگ گئی تو صاف طور پر راناڈے پر یہ

الزام لگایا گیا کہ اس کام کے پیچھے ان کا ہاتھ ہے۔ راناڈے نے ثابت کردیا کہ وہ اس کام میں بالکل شامل نہیں تھے پھر بھی انھیں سب جج بناکر دھولیہ بھیج دیا گیا۔ یہ جگہ ناسک سے بہت چھوٹی تھی اور پونا سے زیادہ دور بھی تھی۔

چند مہینے بعد پھڑ کے کو گرفتار کرلیا گیا۔ اس کی ڈائریوں کو پڑھنے کے بعد ہی انگریزی سرکار کو یہ احساس ہوا کہ راناڈے اس معاملے میں شامل نہیں تھے۔ 1881 میں راناڈے کو بمبئی میں پریسیڈینسی مجسٹریٹ کا عہدہ تین مہینے کے لیے دے دیا گیا۔

راناڈے ایک جج کی حیثیت سے بڑی لگن، ایمانداری اور ہمدردی کے ساتھ اپنے فرائض پورے کرتے تھے۔ وہ عدالت میں جو فیصلے کرتے تھے ان میں کوئی غلطی یا ناانصافی نہیں ہوتی تھی۔ کسی مقدمے کی چھان بین کرنے کے لیے وہ چھوٹی سے چھوٹی بات پر بھی دھیان دیتے تھے۔ ان کی انصاف پسندی کی مثال اس مقدمے سے ملتی ہے جس کا فیصلہ انھوں نے بمبئی میں پریسیڈینسی مجسٹریٹ کی حیثیت سے کیا تھا۔

اس مقدمہ میں انھوں نے پچاس روپے کی چوری کے لیے ایک یوروپین کو 6 مہینے کی سخت سزا کا فیصلہ دیا تھا۔ جب کہ اس سے پہلے ایک ہندوستانی کو 100 روپے کی چوری پر انھوں نے صرف ایک مہینے کی سزا دی تھی۔ راناڈے پر یہ الزام لگایا گیا کہ اس مقدمے میں انھوں نے جانبداری سے کام لیا ہے۔ راناڈے نے اپنی صفائی میں کہا کہ یوروپین شخص نے جو جرم کیا تھا اس کا منصوبہ اس نے پہلے سے ہی بنا رکھا تھا۔ اپنے ہاتھ ایک پستول لے کر وہ ایک ریلوے گارڈ کے کمرے میں داخل ہوا تھا اور روپے چرائے تھے۔ اس کے برخلاف ہندوستانی آدمی نے لالچ میں آکر یہ جرم کیا تھا۔ وہ ایک دکان پر 100 روپے کا نوٹ بھنانے کے لیے گیا تھا اور وہاں پر لالچ نے اُسے گھیر لیا تھا۔

راناڈے کے اچھے کام کی وجہ سے ان کی کافی شہرت ہوگئی۔ 1881 میں انھیں پونا میں اسپیشل سب جج بنادیا گیا۔ اس عہدہ کی وجہ سے انھیں یہ موقع ملا کہ وہ غریب کسانوں کے قریب آئیں اور ان کے مسئلوں کو زیادہ اچھی طرح سمجھ سکیں۔ یہاں پر ان کے پاس زیادہ تر ایسے مقدمات آتے تھے جن کا تعلق جنوبی ہند میں کسانوں سے متعلق ایکٹ (دکن ایگریکلچرسٹ

ریلیف ایکٹ) سے تھا۔ یہ قانون اس لیے بنایا گیا تھا کہ زمین سے متعلق جھگڑوں کا فیصلہ ہو سکے اور مقدموں میں کبھی کبھی کسی پر جو ظلم ہو جاتا ہے وہ ختم ہو۔ ساتھ ہی ساتھ اس کا مقصد یہ بھی تھا کہ مقدموں کا فیصلہ ہونے میں زیادہ لمبا عرصہ نہ لگے۔ راناڈے خود تعلقوں اور ضلعوں میں پہنچ جایا کرتے تھے اور موقع پر خود ریکارڈ کی جانچ کیا کرتے تھے۔ وہ کسانوں سے خود ملتے تھے تاکہ انھیں پیش آنے والی مشکلوں کی صحیح جانکاری ہو سکے۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد وہ ایکٹ کے تحت مسئلوں کا حل، حالات کے مطابق کیا کرتے تھے۔ لوگوں کو راحت پہنچانے کے لیے، وہ اپنا کافی وقت اور توانائی صرف کرتے تھے۔

راناڈے کی شاندار خدمت کا اعتراف کرتے ہوئے 1885 میں انھیں بمبئی لیجسلیٹو کونسل کا ممبر بنادیا گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی ہندوستانی کو یہ مقام ملا تھا۔ 1890 اور 1893 میں وہ پھر سے قانونی ممبر بنے۔ 1893 میں ان کے عہدے میں ترقی دی گئی اور بمبئی ہائی کورٹ کی بینچ میں انھیں شامل کر لیا گیا۔ 1900 تک انھوں نے اسی حیثیت سے کام کیا۔ اس عہدے پر رہ کر انھوں نے ہندو قانون میں نرمی لانے اور خاص طور سے عورتوں کے حقوق منوانے کے لیے اہم کام کیے۔

سماجی مصلح

راناڈے کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ صرف اونچے اونچے سرکاری عہدوں پر رہنے سے ان کو اطمینان نہیں ہوا۔ اپنی سرکاری ملازمت کے کام کرنے کے علاوہ بھی انھوں نے اور کئی ذمہ داریاں اپنے کندھوں پر لے رکھی تھیں وہ چاہتے تھے کہ زندگی کے ہر میدان میں، ہندوستان میں نئے زمانے کی خصوصیتیں پیدا ہوں۔ سماج سدھار کے خیالات اپنے کالج کے زمانے سے ہی اُن کے ذہن میں آنے لگے تھے اور جلد ہی انھوں نے ان پر عمل بھی کرنا شروع کر دیا تھا۔ جب بھی کبھی اُنھیں اپنے دفتری کاموں سے فرصت ملتی وہ کچھ نہ کچھ سماج سدھار کا کام کر لیتے تھے۔

سماج سدھار کے بارے میں جو جوش ان میں پایا جاتا تھا اس کا تعلق ان کے مذہبی خیالات سے بہت گہرا تھا۔ سماج میں جو بے فائدہ اور پیچیدہ رسم ورواج نظر آتے تھے ان کے بارے میں

لوگوں کو سمجھانا بہت ضروری تھا۔ سماج سدھار کے بارے میں راناڈے کے دل میں جو شوق تھا اُسے پورا کرنے کے لیے انھوں نے ایک راستہ نکالا۔ وہ راستہ یہ تھا کہ وہ پرارتھنا سماج میں شامل ہوگئے جو راجہ رام موہن رائے کے برہمو سماج کی طرح کام کرتا تھا۔ پرارتھنا سماج کے مقاصد ان کے دل کو بھا گئے تھے۔ یہ سماج لوگوں کو اس طرف توجہ دلاتا تھا کہ مختلف ذات پات کے لوگ مل جل کر کھانا کھائیں، ایک دوسرے سے شادیاں کریں، بیواؤں کی شادیاں کی جائیں اور عورتوں اور غریب لوگوں کے حالات میں بہتری پیدا ہو۔

اس وقت کے ہندوستانی سماج میں بہت سی سماجی برائیاں پھیلی ہوئی تھیں لیکن سب سے زیادہ نازک معاملہ بیواؤں کی شادی کا تھا۔ یہ بات پہلے بتائی جاچکی ہے کہ اپنے طالب علمی کے زمانے میں ہی راناڈے، وشنو شاستری پنڈت کی قائم کی ہوئی ''ودھوا وواہ اُتیجکا منڈلی'' میں شامل ہوگئے تھے۔ انھوں نے اس بات کا عہد کیا تھا کہ وہ بیواؤں کی شادی کے معاملے کی حمایت کریں گے۔ اس سلسلے میں اس تنظیم نے جو کام کیے اس سے کٹر ہندوؤں میں کافی غم و غصہ پیدا ہوا۔ ایک بار جب ایک بیوہ شادی کے لیے تیار ہوگئی تو منڈلی نے اس کے لیے ایک رشتہ ڈھونڈا۔ اس پر مخالفوں نے بہت شور شرابا کیا۔ انھوں نے ''اندو پرکاش'' کو جلا ڈالنے کی دھمکی بھی دی۔ اس سب کے باوجود وہ شادی ہوئی اور سینکڑوں لوگ اس میں شامل ہوئے۔ یہ کامیابی زیادہ تر راناڈے اور ان کے ساتھیوں کی ہمت اور ان کے پکے ارادوں کی وجہ سے حاصل ہوئی تھی۔ ان کے ساتھیوں میں وشنو پرشرام راناڈے، وشنو شاستری پنڈت اور کئی دوسرے لوگ شامل تھے۔ ایک بیوہ سے شادی کرکے وشنو شاستری پنڈت نے خود ایک مثال قائم کی تھی۔

بیواؤں کی بھلائی کے لیے راناڈے نے جو کام کیا اس کے لیے باہر والوں اور خود ان کے گھر والوں نے بھی کافی نکتہ چینی کی۔ ان کے برہمن نوکروں نے ان کا کام کرنے سے انکار کر دیا، پجاریوں نے ان کی تقریبوں میں پوجا پاٹ کرنے سے انکار کر دیا اور انھیں سماجی بائیکاٹ کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ پھر بھی انھوں نے بیواؤں کی شادی کی ہمت افزائی کرنا جاری رکھا۔ اور ایسی شادیوں کی تعداد کافی بڑھ گئی۔ انھوں نے بیواؤں کی شادیوں کی حمایت میں 200 خط اخباروں میں شائع کرائے۔ انھوں نے ہندو شاستروں، جیسے 'پرانوں'، 'ویدوں' اور 'سمہتاؤں'

کا گہرا مطالعہ کیا۔ انھیں کہیں بھی ایسا کوئی ذکر نہیں ملا کہ بیواؤں کو دوبارہ شادی کرنا منع ہے لیکن کٹر ہندوؤں کو اس بات پر راضی کرنا آسان کام نہیں تھا۔ لوگ ان کے مخالفت کرتے ہی رہے۔

راناڈے نے زور دار طریقے سے بیواؤں کی شادی کی حمایت کی اور بچپن کی شادیوں کی مخالفت کی لیکن یہ عجیب بات ہے کہ وہ خود اپنے خیالوں کے مطابق عمل نہ کرسکے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے والد بہت سخت آدمی تھے۔ اور اپنے خیالات میں ذرا سی بھی تبدیلی لانے کو تیار نہیں تھے۔ 13 سال کی عمر میں ان کی شادی سکو بائی سے کردی گئی۔ 1873 میں سکو بائی تپِ دق کی شکار ہو گئیں۔ گوو ندراؤ کو ڈر تھا کہ بیوی کی موت کے بعد راناڈے اپنے خیالات کے مطابق کسی بیوہ سے شادی کرلیں گے۔ اس بات کو روکنے کے لیے جو کچھ وہ کر سکتے تھے انھوں نے کیا۔ آخر کار ان کے لیے ایک نئی دلہن ڈھونڈلی گئی جس کی عمر صرف 11 سال کی تھی۔ راناڈے نے اس شادی سے بچنے کے لیے 'پورا زور لگایا کیوں کہ ایسی شادی خود اپنے اصولوں کے خلاف تھی۔ لیکن ان کے والد نے ان کی ایک نہ سنی۔ راناڈے نے اپنے والد کے حکم کو کبھی نہیں ٹالا تھا۔ اس لیے آخر کار وہ گیارہ سال کی لڑکی رَمابائی سے شادی کرنے کو تیار ہو گئے۔ رَمابائی مادھوراؤ کرلیکر کی بیٹی تھیں جو ستارہ ضلع کے ایک رئیس خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ راناڈے اپنے اصولوں پر خود عمل نہ کر سکے لیکن جو کوئی بیواؤں کی شادی کے معاملے کی حمایت کرتا تھا وہ اس کی پوری ہمت افزائی کرتے تھے۔ ہر قسم کی رکاوٹوں کا سامنا کرتے ہوئے راناڈے نے بچپن کی شادی کے مسئلے پر بھی توجہ دی۔ انھوں نے حکومت کو بھی اس سلسلے میں کئی بجھاؤ دیے۔ ان کا بجھاؤ یہ بھی تھا کہ سرکار ایک قانون بنا کر لڑکے لڑکیوں کی شادی کے لیے ایک عمر مقرر کردے۔ انھوں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا تھا کہ جو طالب علم اپنی پڑھائی کے زمانے میں شادی نہ کریں صرف انھیں کو ڈگریاں اور تعلیمی امتیازات دیے جائیں۔ ان کا خیال تھا کہ یہ ترکیب کافی کارگر رہے گی لیکن ان کی کسی بات پر بھی عمل نہیں ہو سکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عوام نے ان کی سخت مخالفت کی۔ پھر بھی ایک فائدہ یہ ہوا کہ لوگ ان مسئلوں کی اہمیت کو سمجھنے لگے۔

انھوں نے انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ مل کر 'انڈین نیشنل سوشل کانفرنس' قایم کرنے

کی شروعات کی۔ اس کانفرنس کا مقصد یہ تھا کہ پورے ملک میں سماج سدھار کا کام کرنے والی انجمنیں اور سوسائٹیاں، سر جوڑ کر کام کریں۔ اُن کی رہنمائی سے بہت سے لوگوں کو ایک نئی راہ ملی اور وہ سماجی ترقی کے کاموں کو مل جل کر کرنے کو تیار ہوگئے۔ جو لوگ اس تحریک میں اکھٹے ہوگئے انھوں نے عہد کیا کہ وہ لڑکیوں کو تعلیم دیں گے، بچپن کی شادیوں کو روکیں گے، بیواؤں کی شادیوں کی حمایت کریں گے اور جہیز کی رسم کی مخالفت کریں گے۔

سوشل کانفرنس کا پہلا اجلاس 1887 میں مدراس میں ہوا۔ اس شاندار تنظیم کی کامیابی کا اس بات سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے ہی سال اس میں 549 افراد شامل ہوئے۔ ان لوگوں میں مسلمان اور عیسائی بھی تھے۔ بڑودہ اور اندور کے مہاراجوں نے اس کانفرنس کی سرپرستی کی اور اس کے لیے پیسہ بھی دیا۔

ماہر تعلیم

سماج سدھار کی اپنی اسکیم میں راناڈے عورتوں کی تعلیم کو سب سے اونچا درجہ دیتے تھے۔ عورتوں کی تعلیم کی بات اس زمانے میں کوئی کرتا ہی نہ تھا۔ ان کی بیوی رما بائی بھی پڑھنا لکھنا بالکل نہیں جانتی تھیں۔ عورتوں کی تعلیم کا کام انھوں نے اپنی بیوی سے ہی شروع کیا۔ ان کے خاندان میں جو اور دوسری عورتیں تھیں انھیں اس بات پر بہت غصہ آیا۔ انھیں اس وقت اور گہرا دھکا لگا جب راناڈے نے ایک انگریز عورت مس ہر فرڈ کو گھر آکر رما بائی کو پڑھانے کا کام سونپ دیا۔ خاندان کی عورتیں اس بات کا پورا خیال رکھتی تھیں کہ اس انگریز عورت کے جانے کے بعد رما بائی اشنان کرلے تاکہ وہ کسی چیز کو چھوئے تو وہ چیز ناپاک نہ ہو۔ پونا میں لڑکیوں کے لیے ایک ہائی اسکول شروع کیا گیا تھا۔ راناڈے نے اس موقع پر انگریزی میں تقریر کرنے کے لیے رما بائی کو تیار کرلیا۔ اس بات پر ایک ہنگامہ کھڑا ہوگیا لیکن ان دونوں میاں بیوی نے ساری نکتہ چینی کو بڑی خاموشی کے ساتھ برداشت کیا۔ ولیم ویڈر برن جو راناڈے کے دوست اور خیر خواہ تھے، ان کی اور ان جیسے دوسرے لوگوں کی مدد سے پونا میں حضور پگاہ کے مقام پر راناڈے کو کچھ زمین الاٹ کی گئی تھی، جہاں انھوں نے لڑکیوں کے لیے ایک ہائی اسکول شروع کیا تھا۔ اس اسکول کو عام لوگ "حضور پگاہ اسکول" کے نام سے جانتے

تھے۔ راناڈے کے اس قدام سے کٹر ہندوؤں میں ایک بار پھر غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔

جس زمانے میں راناڈے نے تعلیم کو پھیلانے کا کام شروع کیا اسی زمانے میں ماہرین تعلیم کی ایک دوسری جماعت نے بھی یہی کام شروع کیا تھا۔ اس جماعت میں بال گنگادھر تلک اور پروفیسر جی۔ جی آگرکر شامل تھے۔ 1884 میں انھوں نے 'دکن ایجوکیشن سوسائٹی' قائم کی تھی۔ اس سوسائٹی کا مقصد تعلیم کو سماج کے بڑے حصے تک پھیلانا تھا۔ راناڈے نے سماج سدھار کے سلسلے میں ان کے جذبے اور ان کی سرگرمی کو بہت سراہا۔ راناڈے کو دکن ایجوکیشن سوسائٹی کے پانچ سرپرستوں میں شامل کرلیا گیا۔ ان پانچ سرپرستوں میں بمبئی کے گورنر فرگوسن بھی تھے جن کے نام سے اس سوسائٹی نے کچھ عرصے بعد بمبئی میں فرگوسن کالج قائم کیا تھا۔ باقی تین ممبر ولیم ویڈر برن، 1824 میں نیو انگلش اسکول قائم کرنے والے ایچ۔ پی چپلنکر اور ایک مشہور سماجی مصلح کے۔ ٹی۔ تلنگ تھے۔

عورتوں کی تعلیم کے علاوہ راناڈے نے بمبئی یونی ورسٹی کے کاموں میں بھی سرگرمی سے حصہ لیا۔ وہ اس یونی ورسٹی کی سینیٹ اور سنڈیکیٹ کے ممبر بھی تھے اور فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین بھی۔ انھوں نے یونی ورسٹی کے نصاب میں ہندوستانی زبانوں کو دوبارہ شامل کرنے کی کوشش کی۔ انگریزی نظام تعلیم نے کچھ عرصہ پہلے یونی ورسٹیوں میں ہندوستانی زبانوں کی تعلیم کو ختم کردیا تھا۔ ان کی کئی سال کی کوششوں کے بعد مراٹھی زبان کو نصاب میں شامل کرلیا گیا۔

راناڈے نے دوسرے بہت سے تعلیمی اداروں میں تعلیم کے معیار کو اونچا کرنے میں بھی کامیابی حاصل کی۔ انھوں نے اس بات کی بھی زبردست کوشش کی کہ امتحانوں کی تعداد کو کم کردیا جائے۔ اس کے علاوہ انھوں نے طلباء کی دیکھ بھال اور بھلائی کے کاموں میں بھی گہری دلچسپی دکھائی۔ کچھ طلباء کے رہن سہن کا انتظام ٹھیک نہیں تھا، کچھ طلباء غریبی سے پریشان تھے اور کچھ پڑھائی کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔ یہ مسائل طلباء کے سامنے مشکلات پیدا کرتے رہتے تھے۔ راناڈے ان مسئلوں کو حل کرنے کے لیے لگاتار کوشش کرتے رہے۔ ان کے گھر میں ایسے کئی طلباء آتے جاتے رہتے تھے جن کی پڑھائی میں وہ روپے پیسے سے مدد کرتے تھے۔

تعلیم کے میدان میں راناڈے نے جو اور دوسرے کام کیے وہ بھی قابلِ تعریف تھے۔ وہ ایک بہت اچھے استاد، ایک مشہور عالم اور مورّخ تھے۔ انھوں نے نہ صرف مراٹھا تاریخ میں ریسرچ کی بلکہ یوروپ و ایشیا کی تاریخ کا بھی گہرا مطالعہ کیا۔ مرہٹوں کی تاریخ پر انھوں نے کئی اہم کتابیں لکھیں۔ 1890 میں انھوں نے 'مراٹھا طاقت کا عروج و زوال' (رائز اینڈ فال آف مراٹھا پاور) نامی کتاب لکھی۔ شواجی اس کتاب کا اہم کردار تھے۔ اسی سال انھوں نے 'ستارا کے راجاؤں کا تعارف' اور 'پیشوا کی ڈائریاں' بھی شائع کرائیں۔ 1890 میں انھوں نے مرہٹوں کے دور کے 'سکّے اور ٹکسالیں' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔

ادب اور کلچر کے میدان میں بھی ان کے کام کچھ کم قابلِ تعریف نہیں تھے۔ پونا میں انھوں نے کئی ادارے بنائے اور کئی سرگرمیاں شروع کیں۔ 'تقریر کی ہمت افزائی کی انجمن'، 'پونا سحر لکچرس' 'پونا نیٹو جنرل لائبریری' کی تعمیر، مقامی ادب کی ہمت افزائی کے لیے انجمنِ صنعتی کانفرنس اور نمائش، ریے میوزیم کا قیام، پونا مرکنٹائل بنک کی شروعات وغیرہ وغیرہ ان کے کاموں کی فہرست میں شامل تھے۔ ان سرگرمیوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے دل میں نئے زمانے کے نئے خیالات کی روشنی میں ہندوستان کے شاندار ماضی کو زندہ رکھنے کی زبردست خواہش تھی۔

سارو جنک سبھا

1872 میں راناڈے نے 'سارو جنک سبھا' کے کارکنوں کو منظم کیا تاکہ وہ مہاراشٹر کے مختلف ضلعوں کا سروے کر کے عوام کی مالی حالت کا گہری نظر سے جائزہ لیں۔ اس طرح بہت سی کار آمد معلومات اکٹھا کی گئیں اور ان ہی معلومات کی بنیاد پر ایک رپورٹ تیار کر کے حکومت کو دی گئی۔ اس رپورٹ میں صاف طور پر یہ بات کہی گئی تھی کہ حکومت کی مالگذاری کی پالیسی غریبی کی خاص وجہ ہے۔ 1875 میں اس سبھا نے ایک اور بڑا قدم اٹھایا۔ راناڈے نے ایک میمورنڈم تیار کیا جس میں یہ درخواست کی گئی تھی کہ ہندوستان میں ایک ذمہ دار حکومت قائم کی جائے۔

اس اہم اقدام کے بعد 1876 میں ایک اور قدم اٹھایا گیا۔ یہ وہ سال تھا جب ملکہ وکٹوریہ کو

ملکہ عالیہ کا خطاب دیا گیا تھا۔ راناڈے نے اس موقع کو مناسب سمجھا کہ ہندوستانی عوام کے لیے کچھ رعایتوں کی مانگ کی جائے۔ نرم زبان میں انھوں نے ایک خط لکھا اور ملکہ عالیہ کو بھیج دیا۔ اس خط میں مانگ کی گئی تھی کہ برٹش پارلیمنٹ میں ہندوستانی نمائندوں کی شامل کیا جائے، ہندوستانیوں کو برطانوی شہریوں کی طرح برابر کا سیاسی اور سماجی درجہ دیا جائے اور اپنی سرکار بنانے کی حق دیا جائے۔ حکومتِ برطانیہ سے براہِ راست درخواست کرنے کا ایسا قدم اٹھانے کی ہمت پہلے کسی نے نہیں کی تھی۔

اسی زمانے میں مہاراشٹر میں ایک زبردست قحط پڑا۔ قحط کی مصیبت میں پھنسے لوگوں کی مدد کے لیے سارو جنک سبھا پوری طرح تیار ہو گئی۔ راناڈے نے سماجی کام کرنے والوں کی ایک جماعت تیار کی، تاکہ وہ کھیتی کا حساب رکھنے والے سرکاری افسر، کل کارنی' پوسٹ ماسٹر اور گاؤں کے دوسرے ذمہ دار لوگوں سے مل کر قحط والے علاقوں سے براہِ راست معلومات حاصل کریں۔

اس معلومات کی بنیاد پر راناڈے نے کاغذات تیار کیے اور حکومت کو بھیجے۔ انھوں نے لکھا کہ قحط زدہ لوگوں کو راحت پہنچانے کا سرکاری کام سست اور ناکافی ہے۔ انھوں نے اس سلسلے میں خاص طور سے بمبئی کے گورنر رچرڈ ٹیمپل کا ذکر کیا۔

افسران کی کمزوریوں کو بے نقاب کرنے کا کام راناڈے نے کچھ اتنا زیادہ کیا کہ افسران چوکنے ہو گئے۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ لوگ جن پر وہ حکومت کرتے ہیں ان پر نکتہ چینی کرنے کی بھی ہمت کر سکتے ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ ان کو یہ بتا سکتے ہیں کہ انھیں کیا کام کرنا چاہیے۔

اسی زمانے میں بنگال کے سریندر ناتھ بینرجی جیسے دانشوروں نے راناڈے اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ مل کر کام کرنا شروع کر دیا۔ راناڈے کے خاص ساتھی سیتارام ہری چپلنکر اور لوک ہت وادی دیش مکھ تھے۔ ان سب نے مل کر وائسرائے لارڈ لٹن کی ظالمانہ پالیسیوں کے خلاف آواز اٹھائی۔ افغانستان کے خلاف انگریز جو لڑائی لڑ رہے تھے اس کے خرچ کا بوجھ ہندوستانیوں پر ہی پڑتا تھا۔ ان لوگوں نے اس بے فائدہ جنگ کی مخالفت کی۔

حکومت برطانیہ نے سول سروس کے امتحانوں میں بیٹھنے والے ہندوستانی امیدواروں کی عمر کی آخری حد کچھ کم کردی تھی، ان لوگوں نے اس بات کی بھی مخالفت کی۔

1876 میں ایک طرف مہاراشٹر کے لوگوں کے قحط کی وجہ سے بہت سی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑرہا تھا۔ دوسری طرف انگریزی سرکار نے اسی سال دربار لگایا۔ اس بات سے لوگوں میں غصہ کی ایک لہر سی پھیل گئی۔ 1878 میں مقامی زبانوں کے پریس سے متعلق قانون (ورنا کیولر پریس ایکٹ) پاس ہوا۔ اس بات سے بھی ہندوستانیوں کے جذبات کو بہت ٹھیس لگی۔ اس قانون کے مطابق پریس اور اخباروں پر یہ پابندی لگائی گئی تھی کہ وہ کوئی ایسی چیز شائع نہ کریں جس سے عوام کو حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی تحریک ملے۔ اپنا غصہ ظاہر کرنے کے لیے لوگوں نے بہت سے جلسے کیے اور راناڈے ان تمام جلسوں میں شریک ہوئے۔ سرکاری پالیسیوں پر نکتہ چینی کرتے ہوئے ایک میمورنڈم وائسرائے کو بھیجا گیا۔ ان کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ اس ایکٹ کو 1881 میں ختم کردیا گیا۔ راناڈے نے اپنے کاموں کو زیادہ باثر بنانے کے لیے ایک میگزین 'سارو جنک سبھا' جرنل کا سہارا لیا تھا۔ اس میگزین کے ایڈیٹر سیتارام ہری چپلنکر تھے۔ راناڈے اس میگزین میں زمین، تعلیم، مقامی حکومت جیسے مسائل کے بارے میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ ان چیزوں کے بارے میں لکھنا انھیں بہت اچھا لگتا تھا۔ پہلے ہی سال میں انھوں نے اس میگزین میں 41 مضامین لکھے۔ جب البرٹ بل کے بارے میں بحث شروع ہوئی تو راناڈے کو اپنی رائے ظاہر کرنے کا ایک اہم موقع ملا۔ اس زمانے کے قانون کے مطابق کسی یوروپین پر کسی جرم کے مقدمہ کی سنوائی صرف یوروپین ڈسٹرکٹ اور سیشن جج ہی کر سکتے تھے۔ حالاں کہ بہت سے ہندوستانی جج اس قسم کے فیصلہ کرنے کی قابلیت رکھتے تھے۔

1883 میں البرٹ بل پاس ہو گیا۔ اس کا مقصد ہندوستانی اور یوروپین ججوں کا فرق ختم کرنا تھا۔ اس بات سے یوروپین لوگوں میں کافی بے اطمینانی پھیل گئی۔ حالات کو دیکھتے ہوئے اس قانون کو ختم کردیا گیا تاکہ یوروپین لوگ خوش ہو جائیں لیکن دوسری طرف ہندوستانی لوگوں نے اس بات سے، اپنی توہین محسوس کی۔

راناڈے نے 'سارو جنک سبھا جرنل' میں ایک مضمون لکھا جس میں سرکار کے اس نامناسب

رویے کی سخت مخالفت کی گئی تھی۔ انھوں نے اعلان کیا کہ کسی قوم پر کسی دوسری قوم کی حکومت کی بات اب زیادہ دیر نہیں چلے گی۔ ان کے قلم میں بہت جان تھی۔ اپنی تحریروں کے ذریعہ انھوں نے اپنے ملک والوں کو یہ پیغام دیا کہ وہ بغیر وقت ضائع کیے خود اپنی حکومت چلانے کا انداز سیکھیں۔ انھوں نے ہندوستانیوں کو یہ سمجھایا کہ اپنے جائز حقوق حاصل کرنے کے لیے اتحاد اور تنظیم بہت ضروری ہے۔ ان کی اُن تحریروں کا عوام کے دماغوں پر زبردست اثر پڑا۔

ماہر اقتصادیات

ہندوستانیوں کی مالی حالت میں ترقی کو راناڈے ہندوستان کی سیاسی اور سماجی ترقی کے برابر ہی اہمیت دیتے تھے۔ راناڈے نے ہندوستان کی کھیتی باڑی، صنعت، ملک سے باہر جاکر آباد ہونے، قرض ملنے کی آسانی، غرض کہ ہندوستانی اقتصادیات کے ہر پہلو کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔ انھوں نے سوئزرلینڈ، فرانس، اٹلی اور بلجیم جیسے یوروپی ممالک کی اقتصادیات پر بھی نظر ڈالی اور یہ دکھانے کی کوشش کی کہ ہندوستان ان ملکوں سے کیا سیکھ سکتا ہے۔

راناڈے نے ہندوستان کی مالی مشکلات کے بارے میں جو معلومات حاصل کی تھیں ان کی وجہ سے انھیں ایک راستہ مل گیا تھا۔ جس کے ذریعے کہ وہ حکومت کو ہندوستان کی غریبی کی وجوہات تفصیل سے بتا سکتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ غریبی کی وجہ پہلے بھی یہی تھی اور اب بھی یہی ہے کہ ہندوستان میں کھیتی پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ کیا جاتا ہے۔ کھیتی ایک ایسا کام ہے، جس میں سیلاب، بارش کی کمی، قحط، آبپاشی کی ناکافی سہولیت، کھیتوں کا چھوٹا ہونا، بھاری لگان اور کسانوں کو راحت پہنچانے کے کاموں کی کمی، ہمیشہ مشکلات پیدا کرتی رہتی ہیں۔

ہندوستان کی غریبی کی دوسری وجہ برطانیہ کی تجارتی پالیسی تھی۔ انگلینڈ ہندوستان سے کچا مال کم قیمت پر منگاتا تھا۔ اس کچے مال سے انگلینڈ میں مشینوں کے ذریعہ کھلونے، چمڑے کا سامان، موم بتیاں جیسی چیزیں بنائی جاتی تھیں اور انھیں ہندوستان میں بیچا جاتا تھا۔ اس قسم کا سامان مہنگا تھا اور عام آدمی ایسی چیزوں کو استعمال بھی نہیں کرتا تھا۔ یہ تو خوش حال ہندوستانیوں کے کام کی چیزیں تھیں۔ مشینوں سے بنی ہوئی چیزوں کی زیادتی سے ہندوستان

کی گھریلوں صنعتوں کو بہت نقصان پہنچا اور لاکھوں کاریگر بے روزگار ہوگئے۔ اپنا پیٹ بھرنے کے لیے انھوں نے کھیتی کو اپنایا جس سے انھیں تقریباً کچھ نہیں ملتا تھا۔

1890 میں پونا میں ہوئی ایک صنعتی کانفرنس میں راناڈے نے کہا تھا " 50 سال پہلے ہندوستانی لوگ ہندوستان میں بنے ہوئے کپڑے سے اپنا تن ڈھانکتے تھے۔ لیکن اب دور بیٹھے ہوئے مالک ہندوستانیوں کو کپڑے پہناتے ہیں۔" دادا بھائی نوروجی کی طرح راناڈے بھی اس بات میں یقین رکھتے تھے کہ ہندوستان کی دولت کھنچ کھنچ کر حکمرانوں کے ملک یعنی انگلینڈ پہنچ رہی ہے۔ تاریخ میں اس نظریے کو نکاس (یاڈرین) تھیوری' کہا جاتا ہے۔

جس بات کی سخت ضرورت تھی وہ یہ تھی کہ ہندوستان میں کھیتی اور صنعت کے میدان میں مشینوں کا استعمال کیا جائے۔ انھوں نے یہ سجھاؤ دیا کہ جو لوگ اس قسم کا کام کرنا چاہیں انھیں حکومت قرضے دے۔ انھوں نے عوام سے اپیل کی کہ وہ اپنے پیسے سے سونا نہ خریدیں بلکہ اپنا پیسہ صنعتوں میں لگائیں۔ 1890 میں انھوں نے 'مغربی ہندوستان کی صنعتی انجمن' (انڈسٹریل ایسوایشن آف ویسٹرن انڈیا) قائم کی۔ اس کام میں جی۔ ڈبلیو۔ جوشی اور ایک مشہور وکیل ڈنشا ایڈلجی واچا نے ان کی مدد کی تھی۔ اس انجمن کا مقصد تھا کہ استعمال کی چیزیں انگلینڈ سے نہ منگا کر ہندوستانی لوگ اپنے گھروں میں بنائیں اور ان ہی سودیشی چیزوں کا استعمال کریں۔ اس قسم کی تنظیم کو انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ ساتھ چلانے کا ارادہ تھا۔ جس طرح انڈین سوشل کانفرنس سماج سدھار کے مقصد سے قائم کی گئی تھی اسی طرح اس انجمن کا مقصد بھی سیاسی سدھار کے ساتھ اقتصادی سدھار کرنا تھا۔

کچھ دوسری باتوں میں بھی راناڈے کے اقتصادی نظریات اس زمانے سے بہت آگے تھے۔ انھوں نے حکومت کے ذریعہ زراعتی بینک قائم کرنے کا خیال بھی پیش کیا تھا تاکہ ان بینکوں سے ساہوکاروں اور کسانوں کو کم سود پر قرضہ مل سکے۔

سر جے۔ سی۔ کویاجی ایک مشہور ماہر اقتصادیات تھے۔ ہندوستانی اقتصادیات کے سارے پہلوؤں پر راناڈے کی گہری نظر اور معلومات کو دیکھ کر انھوں نے کہا تھا "راناڈے ہندوستان کے پہلے ماہر اقتصادیات تھے کیوں کہ وہ ہمارے ملک کے تمام مالی مسئلوں کو اچھی طرح سمجھتے

تھے اور اقتصادی اصولوں کے مطابق ان مسئلوں کو صحیح طور پر پیش کرتے تھے۔"بعد کے زمانے میں جو ماہر اقتصادیات میدان میں آئے انھوں نے راناڈے کو 'ہندوستان کی اقتصادیات کا باوا آدم' کہا۔

انگلینڈ کے وزیر اعظم ولیم گلیڈاسٹون نے 1871 میں فاسیٹ کمیٹی (Fowcett Committee) مقرر کی۔ اس کمیٹی کا مقصد ہندوستان کے اقتصادی معاملات کے بارے میں چھان بین کرنا تھا۔ چار سال تک اس قسم کی چھان بین چلتی رہی اور راناڈے نے ہی ان ساری معلومات کا خلاصہ۔ تیار کیا۔ یہ خلاصہ مضامین کی شکل میں وقتاً فوقتاً "اندو پرکاش" میں شائع ہوا۔ 1878 میں انھیں مضامین کو ملا کر ایک کتاب تیار کی گئی جس کا نام تھا" ریوینیو مینول آف دی انڈین ایمپائر" (حکومت ہند کی آمدنی کا مینول) اس کتاب میں ہندوستان کی مالیات کا جائزہ لیا گیا تھ۔ 1886 میں ایک فائنانس کمیٹی بنائی گئی تھی، جس کا مقصد حکومت کی آمدنی اور خرچ کا مطالعہ کرنا تھا اور یہ بتانا تھا کہ خرچ کو کس طرح کم کیا جاسکتا ہے۔ راناڈے ان چند ہندوستانیوں میں سے ایک تھے جن کے اہم کاموں کی تعریف فائنانس کمیٹی نے کی تھی۔

کانگریس

راناڈے باقاعدہ طور پر ہندوستانی سیاست میں حصہ نہیں لے سکتے تھے کیوں کہ وہ برطانوی سرکار کی ملازمت میں تھے۔ سیاسی مسئلوں پر ان کے مضامین اکثر کسی دوسرے کے نام سے شائع ہوتے تھے۔ بہت سے سیاسی مسائل کے بارے میں ان کے خیالات بالکل صاف تھے۔ وہ حکمرانوں کی کمزوریوں کو ظاہر کرنے سے بالکل نہیں جھجکتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس بات سے حکمران ناخوش ہوتے تھے۔ راناڈے برطانوی سرکار سے ہندوستان کو جو فائدے پہنچ رہے تھے، اور ہندوستان کی اپنی کمزوریوں کو اچھی طرح سمجھتے ہوئے یہ بات بھی اچھی طرح سمجھتے تھے کہ ہندوستان پر خود ہندوستانیوں کی حکومت ہونی چاہیے۔

راناڈے کا مقصد تھا کہ ہندوستانی شہریوں کو سیاسی تعلیم دے کر یہ سمجھایا جائے کہ ان کے کیا حقوق ہیں اور ان کو کس قسم کی رعایتیں حاصل ہیں۔ یہ کام وہ بالکل پرامن طریقے سے کرنا چاہتے تھے۔ اے۔او ہیوم ایک ریٹائرڈ برطانوی سول سرونٹ تھے۔ انھوں نے جب 72

مخلص ہندوستانیوں کو اکٹھا کر کے 28 دسمبر 1885 کو انڈین نیشنل کانگریس قائم کی تو رانا ڈے اس میں شامل ہو گئے۔ لیکن ان کی شمولیت باقاعدہ نہیں تھی۔ راناڈے نے کانگریس کی شروعات سے ہی بڑی لگن کے ساتھ کانگریس کی حمایت کی یہی وجہ تھی کہ اے۔ او۔ ہیوم ان کو اپنا ''سیاسی گرو'' کہتے تھے۔

ایک کے بعد ایک سال گزرتا گیا لیکن کانگریس پر راناڈے کا اثر بدستور قائم رہا۔ وہ کانگریس کے ہر اجلاس میں شامل ہوتے تھے اور اپنی رائے اور اپنے سجھاؤ پیش کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ کانگریس صرف سیاسی اصلاح کا کام نہ کرے بلکہ ساتھ ہی ساتھ سماج سدھار اور اقتصادی اصلاح کا کام بھی کرے۔

ہندوستان کی آزادی کی تاریخ میں یہ وہ زمانہ تھا جب آزادی حاصل کرنے کے طریقوں کے چناؤ میں اختلاف پیدا ہونے لگا تھا۔ بال گنگادھر تلک نے تعلیم کے معاملے میں بڑی لگن کے ساتھ کام کیا تھا اور اسی لیے وہ کچھ عرصہ پہلے راناڈے کے قریب آگئے تھے۔ اب بال گنگا دھر تلک کے خیالات میں تبدیلی آگئی تھی۔ راناڈے سارے معاملات میں سدھار چاہتے تھے۔ لیکن بال گنگادھر تلک صرف سیاسی سدھار پر اپنی ساری توجہ دینا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ سماج سدھار کا کام آزادی مل جانے کے بعد کیا جائے گا۔ وہ چاہتے تھے کہ آزادی فوری طور پر ملے چاہے اس کے لیے طاقت کا استعمال کرنا پڑے۔

راناڈے تشدد اور طاقت کے استعمال میں یقین نہیں رکھتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ سیاسی تبدیلی رفتہ رفتہ آئے اور لگاتار ترقی ہوتی رہے۔ راناڈے اور تلک دونوں کو ہی وطن سے سچی محبت تھی اور دونوں میں یہ صلاحیت موجود تھی کہ عوام کو اپنے خیالات سے متاثر کر سکیں۔ راناڈے اپنے دفتری کاموں میں الجھے رہتے تھے اس لیے ایک سیاسی لیڈر کی حیثیت سے تلک کے ساتھ ساتھ نہیں چل سکے۔ اسی فرق کی وجہ سے 'سارو جنک سبھا' میں بٹاؤ پیدا ہو گیا۔ مجبور ہو کر راناڈے کو 'دکن سبھا' کے نام سے ایک دوسری انجمن بنانی پڑی۔ اس کام میں ان کے شاگرد گوپال کرشن گوکھلے نے ان کو مدد دی۔ انھوں نے گوپال کرشن گوکھلے کو پرامن طریقے سے آزادی حاصل کرنے کی تربیت دی تھی۔

اس طرح آزادی کی لڑائی لڑنے والے سپاہی دو جماعتوں میں بٹ گئے۔ ایک جماعت کی پالیسی نرم تھی اور دوسری جماعت والے آزادی حاصل کرنے کے لیے تشدد کے استعمال کے قائل تھے۔ پہلی جماعت کے لوگ سمجھوتہ، انصاف پسندی اور رفتہ رفتہ آزادی پانے کے اصولوں کو مانتے تھے۔ دوسری جماعت کے لوگ غیر ملک والوں کی غلامی کے جوئے سے فوراً آزاد ہونا چاہتے تھے۔ ہمارے عظیم رہنما مہاتما گاندھی اور گوپال کرشن گوکھلے جیسے اور کچھ لوگ، پہلی جماعت کی نرم پالیسی میں یقین رکھتے تھے۔

آخری زمانہ

جلد ہی اپنے کاموں میں زیادہ محنت کرنے سے راناڈے کی صحت خراب ہونے لگی۔ اب ان میں وہ طاقت بھی باقی نہیں رہی جس سے وہ پہلے کام کیا کرتے تھے۔ 1900 میں تو ان کی ایسی حالت ہو گئی تھی کہ وہ لاہور میں ہونے والی سوشل کانفرنس میں بھی شرکت نہ کر سکے۔ ڈاکٹروں نے انھیں مکمل آرام کا مشورہ دیا پھر بھی انھوں نے اپنا کام نہیں چھوڑا۔ اس عرصہ میں وہ برابر پڑھتے اور لکھتے رہے اور اسی کو آرام سمجھتے رہے۔

ان کی بیماری انھیں روز بروز کمزور کرتی رہی۔ شام ہوتے ہوتے ان کی سانس پھول جاتی تھی اور انھیں گھٹن سی محسوس ہونے لگتی تھی۔ سینے میں تیز درد اٹھتا تھا اور ان کے اعصاب پھڑکنے لگتے تھے۔ کچھ دیر کے بعد وہ ٹھیک ہو جاتے تھے مگر اگلی شام کو پھر ویسی ہی حالت ہو جاتی تھی۔ اس حالت میں بھی راناڈے اپنی صحت کے مسئلے کا حل ڈھونڈنے کے لیے ڈاکٹری کی کتابیں کھنگالتے رہے۔ ان کتابوں کے پڑھنے سے ان کو پتہ چلا کہ ان کو دل کی ایک بیماری تھی جس کو "انجی نا پکٹورس" کہا جاتا ہے۔ آج کل یہ بیماری کافی عام ہے۔ راناڈے کو بیماری کے حملے بار بار ہونے لگے اور تکلیف زیادہ دیر تک رہنے لگی۔ 16/ جنوری 1901 میں 59 سال کی عمر میں ان کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ وہ وطن سے سچی محبت رکھنے والے ایک سماجی مصلح اور ہندوستان کے سچے سپوت تھے۔ وہ یہ امید لے کر اس دنیا سے چلے گئے کہ ان کی یہ باتیں ایک دن سچ ہو جائیں گی۔ "ایک نیا ہندوستان زندگی کے نئے حالات میں پیدا ہو گا اور اس میں ذات پات، رنگ و مذہب کے فرق کی کوئی گنجائش نہیں ہو گی۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہم

اول بھی ہندوستانی رہیں اور آخر بھی ہندوستانی۔ .... ہم یہ امید نہیں کر سکتے کہ پرانا ہندوستان پھر سے لوٹ آئے گا لیکن یہ ہمارے بس میں ہے کہ ہم مستقبل کا ہندوستان بنائیں۔"

ایک دن آئے گا جب ہندوستان کے لوگ آزاد ہوں گے۔ان کے دلوں میں خوشگوار امیدیں کروٹیں لیں گی،ان کے اندر ایسا یقین پیدا ہو گا کہ وہ اپنے فرض سے کوتاہی نہیں کریں گے، وہ انصاف پسندی کے سہارے سب کے ساتھ برتاؤ کریں گے،ان کے دماغ روشن ہوں گے اور ان کی طاقت بے لگام نہیں ہوگی۔ سب سے بڑی بات یہ ہوگی کہ یہاں بے حد و حساب پیار ہوگا۔ اس قسم کا نیا ہندوستان دنیا بھر کے ملکوں میں اپنا ایک مناسب مقام حاصل کرے گا۔اور اپنے حالات اور اپنی قسمت کا خود مالک ہوگا۔ یہ ہے وہ منزل جہاں ہمیں پہنچنا ہے، اور ایسی ہے وہ سرزمین جس میں ہم کو رہنا ہے۔ وہ لوگ خوش قسمت ہیں جو دور سے یہ خواب دیکھتے ہیں۔ وہ لوگ اور زیادہ خوش قسمت ہیں جو اس منزل تک پہونچنے کے لیے راستہ بناتے ہیں اور سب سے زیادہ خوش قسمت ہوں گے وہ لوگ جو اس خواب کو اپنی آنکھوں سے پورا ہوتے دیکھیں گے اور اس مقدس سرزمین پر چل پھر سکیں گے۔

(مہادیو گووند رانا ڈے)

محمد اقبال

شاہینہ خان

پربت وہ سب سے اونچا ہم سایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا

غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی، دل ہو جہاں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم، وطن ہے، ہندوستان ہمارا

محمد اقبال

محمد اقبال

'ہم ہندوستانی ہیں اور ہندوستان ہمارا وطن ہے۔' یہ تصور ہر حال میں باقی رہے گا۔

شیخ محمد اقبال 22/ فروری 1873 کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد شیخ نتھو ایک کشمیری سوداگر تھے اور ان کی والدہ کا نام بیگم امام بی بی تھا۔ یہ لوگ سیالکوٹ میں رہتے تھے۔ محمد اقبال کا تعلق ایک برہمن خاندان سے تھا جس نے تین سو سال پہلے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اقبال کو اپنے خاندانی سلسلے پر فخر تھا۔ ان کا شعر ہے:

میں اصل کا خاص سومناتی
آباء میرے لاتی و مناتی

اقبال نے اپنی شاعری میں اپنے خاندان کے برہمن ہونے کا ذکر بار بار کیا ہے۔ وہ اپنے ایک دوسرے شعر میں کہتے ہیں کہ 'مجھے دیکھو۔ پھر ہندوستان میں ایسا دیکھنے کو نہیں ملے گا۔ میں وہ ہوں جو برہمنوں کے خاندان سے نکلا اور مولانا روم اور تبریز کے تصوف کی گہرائیوں میں اتر گیا۔'

اقبال کی شاعری پر پہلی نظر ڈالنے سے ہی یہ پتہ چل جاتا ہے کہ ان کو اپنے وطن سے بہت محبت تھی اور وہ ہندوستان میں قومی اتحاد، بھائی چارہ اور مساوات پیدا کرنا چاہتے تھے۔ کس نے وہ مشہور گیت نہیں سنا جو ہر ہندوستانی کی زبان پر رہتا ہے:-

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

تعلیم

اقبال نے ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے

1895 میں لاہور آ گئے۔ انٹر میڈیٹ کالج میں ان کے استاد ایک عظیم مشرقی عالم تھے اور وہ تھے شمس العلماء میر حسن۔ اقبال کا رجحان اسلامیات کے مطالعہ کی طرف ہوا تو انھیں احساس ہوا کہ وہ اپنے ان استاد کے قرض کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں "علی کے اعلیٰ خاندان کے لیے باعثِ فخر، جن کی چوکھٹ میرے لیے ہمیشہ کعبہ کی طرح مقدس رہے گی۔ جن کی تعلیمات نے ہمیشہ میرے دماغ کو تحریک دی ہے اور ان کی محبت بھری رہنمائی سے میرے اندر تنقید کی صلاحیت پیدا ہوئی ہے۔"

اقبال نے 1897 میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے پاس کیا۔ انگریزی ادب، فلسفہ اور عربی ان کے مضامین تھے۔ وہ ایک انتہائی ذہین طالب علم تھے۔ عربی اور انگریزی میں اپنی صلاحیت کی وجہ سے ان کو دو گولڈ میڈل ملے تھے اور وظیفہ بھی ملا تھا۔

لاہور میں رہتے ہوئے اقبال کا تعلق پروفیسر تھامس آرنلڈ اور عبدالقدیر صاحب سے پیدا ہوا۔ پروفیسر آرنلڈ کو اقبال کی صلاحیتوں کا اندازہ تھا۔ انھوں نے اس نوجوان طالب علم کے دماغ میں مغربی دنیا کے خیالات و نظریات بھر دیے اور یہ شوق پیدا کر دیا کہ وہ مغربی ادب کا مطالعہ کریں۔ اس طرح اقبال ایک ایسے خوش قسمت انسان تھے کہ ان کے سامنے مشرقی اور مغربی ادب کے راستے کھل گئے۔ انھوں نے اس بات کو مانا ہے کہ مغرب کے فلسفیوں نے ان کے علم میں اضافہ کیا اور روحانی نظر رکھنے والوں کی صحبت نے ان کے دل میں روشنی پیدا کی۔

1899 میں انھوں نے فلسفہ میں ایم۔ اے پاس کیا اور امتیازی حیثیت حاصل کرنے کی وجہ سے ان کو میڈل بھی ملا۔

ابتدائی شاعری

عبدالقدیر ایک بہت باوقار رسالہ "مخزن" نکالا کرتے تھے۔ اس رسالے میں اقبال کی شاعری اُسی زمانے میں شائع ہونے لگی تھی جب وہ سیالکوٹ میں رہتے تھے۔
اُس زمانے میں مرزا داغ دہلوی اردو شاعری کے عظیم استاد مانے جاتے تھے۔ اقبال نے اپنی غزلیں اصلاح کے لیے داغ کو بھی بھیجنی شروع کر دیں۔ کچھ غزلوں کی اصلاح داغ نے کی اور

یہ کہہ کر ان کا باقی کلام واپس بھجوا دیا کہ اقبال کی شاعری کو اصلاح کی ضرورت نہیں ہے۔
لاہور میں اکثر مشاعرے ہوا کرتے تھے اس زمانے کی اقبال کی ایک نظم کا شعر ہے:-

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

اس شعر سے اردو کے مشہور استاد، ارشد بہت متاثر ہوئے تھے اور انھوں نے پیشن گوئی کی تھی کہ مستقبل میں اقبال کا اقبال بہت بلند ہوگا۔

لاہور میں ایک ادبی سوسائٹی بنائی گئی تھی جس کے ممبروں میں اس زمانے کے مشہور مصنف شامل تھے۔ اقبال اس سوسائٹی کے ممبر بن گئے اس سوسائٹی کی ایک نشست میں اقبال نے اپنی نظم "ہمالیہ" سنائی جس کو بہت پسند کیا گیا۔ اس نظم میں فارسی کے پرانے محاوروں میں نئے خیالات پیش کیے گئے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ نظم سے وطن سے بے انتہا محبت کا بھی اظہار ہوتا تھا۔ اِس نظم میں اس ہندوستانی نوجوان کی مستقبل کی تمنائیں بھی جھلکتی تھیں۔ نظم "ہمالیہ" پہلی بار عبدالقدیر کے رسالہ "مخزن" اپریل 1901 میں شائع ہوئی۔ اس نظم کا پہلا شعر ہے:-

اے ہمالہ اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں

اقبال کی دوسری ابتدائی نظمیں جیسے 'چاند' بھی "مخزن" میں شائع ہوئیں جنھیں ناقدین نے بہت پسند کیا۔ ان کے خیال میں یہ نظمیں اردو شاعری کے لیے ایک نیا راستہ ہموار کر رہی تھیں۔ "نالۂ یتیم" اور "ابرِ گوہر بار" جیسی نظموں نے اردو شاعری میں ایک نئے پہلو کا اضافہ کیا اور یہ ثابت کر دیا کہ اقبال کی شاعرانہ صلاحیت کو چار چاند لگ گئے ہیں۔ اب اقبال کو اردو ادب کے آسمان میں ایک نئے ابھرتے ہوئے ستارے کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا۔

اقبال لاہور کے اورینٹل کالج میں لکچرر ہو گئے اور وہاں پر انھوں نے تاریخ، فلسفہ اور سیاسیات کی تعلیم دی۔ بعد میں وہ گورنمنٹ کالج میں آ گئے اور وہاں انھوں نے فلسفہ اور

انگریزی ادب پڑھایا۔

اقبال کی شادی کریم بی بی سے ہوئی۔ آفتاب اور معراج نام کے دو بچے بھی ہوئے۔ کافی عرصے بعد ان کی دوسری شادی سردار بیگم سے ہوئی اور ان سے جاوید اور منیرہ بیگم، دو بچے پیدا ہوئے۔

باہر کے ملکوں میں تعلیم

پروفیسر تھامس آرنلڈ نے اقبال کو مشورہ دیا کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے یوروپ جائیں۔ 1905 میں اقبال یوروپ کے لیے روانہ ہوگئے۔ انھوں نے کیمبرج یونی ورسٹی کے ٹری نٹی کالج سے فلسفہ اور اکنامکس (معاشیات) میں بی۔ اے آنرس کیا۔ کچھ عرصہ کے لیے لندن یونی ورسٹی میں اقبال نے عربی بھی پڑھائی۔ اس کے بعد وہ جرمنی چلے گئے جہاں سے انھوں نے میونخ یونی ورسٹی سے 1908 میں فلسفے میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔

جرمنی سے وہ پھر لندن لوٹ آئے تاکہ قانون کی تعلیم حاصل کر سکیں یہاں پر انھوں نے معاشیات اور سیاسیات میں آنرس کے امتحانات پاس کیے اور تھوڑے دن لندن اسکول آف کامرس میں استاد بھی رہے۔

اقبال 1905 سے 1908 تک یوروپ میں رہے اور اس عرصہ میں انھوں نے بہت سی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ اس کے علاوہ اسلامی مضامین پر بہت کچھ لکھا اور بہت سے لکچر بھی دیے۔

1908 میں اقبال یوروپ سے لاہور لوٹ آئے۔ لاہور میں انھوں نے گورنمنٹ کالج میں پروفیسر کی حیثیت سے فلسفہ اور انگریزی ادب پڑھانا شروع کیا۔ گورنمنٹ کالج میں روزانہ کچھ ہی گھنٹے کام کرتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ وکالت بھی کرتے تھے۔ 1911 میں انھوں نے کالج کی ملازمت چھوڑ دی اور اپنی ساری توجہ قانون اور شاعری کی طرف لگادی۔

ملکہ وکٹوریہ کی موت پر اقبال نے جو نظم لکھی تھی اس کو سبھی نے پسند کیا۔ پنجاب کے گورنر ایڈورڈ میک لیگن، اقبال کی صلاحیتوں سے بہت متاثر ہوئے اور 1922 میں ان کو نائٹ (Knight) یعنی ''سر'' کا خطاب دیا۔

1927 میں اقبال پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے لیے چن لیے گئے۔1930 میں وہ سائمن کمیشن کے ممبروں کے ساتھ کی گئی بات چیت میں شامل ہوئے اور اسی سال مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے صدر بھی بنے۔

32-1931 میں اقبال دوبارہ یوروپ گئے اور فرانس، اٹلی اور اسپین کے مختلف ادیبوں، فلسفیوں اور دانشوروں سے ملے۔

یروشلم میں انھوں نے، اسلامی کانفرنس میں شرکت کی۔1933 میں افغانستان کی حکومت نے انھیں کابل آنے کی دعوت دی۔ حکومت افغانستان، سارے افغانستان اور خاص طور سے کابل شہر میں، تعلیمی سدھار کے بارے میں ان کے قیمتی مشورے لینا چاہتی تھی۔

اقبال نے دہلی کی جامعہ ملیہ یونی ورسٹی میں بھی گہری دل چسپی لی۔ اقبال 1934 تک وکالت کے پیشے میں لگے رہے۔اس کے بعد ان کی صحت گر گئی اور انھوں نے وکالت چھوڑ دی۔ اسی زمانے میں ان کی بیوی سردار بیگم کا انتقال ہو گیا۔ ایک لمبی بیماری کے بعد 21/اپریل1938 کو اقبال بھی اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ان کے انتقال کے وقت ان کا بڑا بیٹا آفتاب اقبال 36 سال کا تھا اور لاہور میں وکالت کرتا تھا۔ان کے دوسرے بیٹے جاوید کی عمر اس وقت صرف 14 سال تھی اور وہ اسکول میں پڑھ رہا تھا۔

اقبال کی نظر میں ایک شاعر کا اصل کام یہ ہے کہ وہ لوگوں کو زندگی کے مسئلوں سے ہمت کے ساتھ نپٹنا سکھائے۔ شاعری کی طرح ہر فن کا مقصد انسانی زندگی کو بہتر اور خوب صورت بنانا ہوتا ہے۔ اگر کوئی فن کار یہ کام نہیں کر پاتا تو اس کا مطلب یہ سمجھا جانا چاہیے کہ وہ اپنے مقصد میں ناکام رہا۔

رابندر ناتھ ٹیگور نے اقبال کے بارے میں جو کچھ کہا تھا اس سے بہتر کوئی نذرانہ عقیدت نہیں ہو سکتا۔ ٹیگور نے کہا تھا "اقبال کی موت نے ہمارے ادب میں ایک خلاء پیدا کر دیا ہے ہے۔ یہ خلاء ایک خطرناک زخم کی طرح ہے جس کو بھرنے میں بہت وقت لگے گا۔ دنیا کے ممالک میں ہندوستان کی حیثیت بہت معمولی سی ہے۔ ایسی حالت میں ایک ایسے شاعر کا انتقال، جس کی شاعری ساری دنیا کے لیے قیمتی ہے ایک ایسا نقصان ہے جس کی کمی پوری

نہیں کی جاسکتی۔"

وطن سے محبت کا جوش

اقبال نے اردو اور فارسی میں ہر طرح کی شاعری کی۔ انھوں نے نغمات بھی لکھے اور اردو رزمیہ نظمیں بھی، مرثیے بھی لکھے اور فلسفیانہ اور طنزیہ شاعر بھی کی۔ عمر خیام کی طرح انھوں نے رباعیاں بھی لکھیں۔ ان کی فلسفیانہ شاعری، فارسی کے عظیم عالم جلال الدین رومی کی یاد دلاتی ہے اور ان کی رزمیہ شاعری کا مقابلہ دانتے اور ملٹن سے کیا جاسکتا ہے۔

اقبال کے مشہور اردو مجموعہ کلام میں "بانگِ درا"، "بالِ جبریل"۔ "ضربِ کلیم" اور "ارمغانِ حجاز" شامل ہیں۔ فارسی میں "اسرارِ خودی"، "رموزِ بے خودی۔" "پیامِ مشرق" "زبورِ عجم" اور "جاوید نامہ" مشہور کتابیں ہیں۔

"بانگِ درا" کی ساری نظموں سے کوئی نہ کوئی عظیم مقصد جھلکتا ہے۔ ان سے اقبال کی وطن سے پرجوش محبت کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ ساری دنیا کے انسانوں سے محبت کا اظہار انھوں نے بڑے فن کارانہ اور صوفیانہ ڈھنگ سے کیا ہے۔ اقبال کی شاعری سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے وطن سے سچی محبت رکھتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ساری دنیا سے بھی محبت رکھتے تھے۔ "رامِ ہند"، "نیا شوالہ"، "میرا وطن وہی ہے" اس کی چند مثالیں ہیں۔ "میرا وطن وہی ہے" میں ہندوستان کی عظمت کا ذکر اس طرح ہے:-

یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا
سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا
مٹی کو جس کی حق نے زر کا اثر دیا تھا
ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

ان کی "رامِ ہند" نظم سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ہندوؤں کے جذبات کا کتنا خیال رکھتے تھے۔

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند

تلوار کا دھنی تھا شجاعت میں مرد تھا
پاکیزگی میں، جوشِ محبت میں فرد تھا

بچوں کا ادب

اقبال نے بچوں کے لیے جو نظمیں لکھیں ان میں سے زیادہ تر "بانگِ درا" میں شامل ہیں۔ یہ نظمیں بڑی سیدھی سادی ہیں اور ہر ایک نظم کوئی نہ کوئی اخلاقی سبق دیتی ہے۔ ان نظموں کو سبھی پسند کرتے ہیں۔ ان کی نظم "مکڑا اور مکھی" میں ایک مکھی اور ایک مکڑی کے درمیان بات چیت دکھائی گئی ہے۔ مکھی کو دیکھ کر مکڑی کے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ مکھی اس کے لیے بڑی اچھی غذا ہے۔ مکڑی مکھی کو اپنے جالے میں آنے کی دعوت دیتی ہے۔ پہلے پہل مکھی اس کو جھڑک دیتی ہے اور کہتی ہے کہ میں بے وقوف نہیں کہ ترے جال میں پھنس جاؤں۔ لیکن مکڑی بہت دوستی جتاتی ہے اور بڑی معصوم بن جاتی ہے۔ وہ مکھی کی خوب صورتی کی تعریف ہر طریقے سے کرتی ہے تاکہ مکھی اس کے جال میں پھنس جائے۔ مکھی اپنی تعریف سے پگھل جاتی ہے اور مکڑی کے جال میں داخل ہو جاتی ہے اور مکڑی اس کو ہڑپ کر جاتی ہے۔ اس نظم سے یہ سبق ملتا ہے کہ ہم کو جھوٹی تعریف سے خبردار رہنا چاہیے۔

"پہاڑ اور گلہری" میں پہاڑ اپنی بڑائی کی ڈینگیں مارتا ہے اور ننھی گلہری کا مذاق اُڑاتا ہے۔ گلہری فوراً جواب دیتی ہے کہ پہاڑ تو بے شک بڑا ہے لیکن ایک قدم بھی نہیں چل سکتا جب کہ میں پیڑوں پر بھاگی بھاگی پھرتی ہوں۔ گلہری پہاڑ کو ایک چھالیہ توڑنے کے لیے کہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ پہاڑ یہ کام نہیں کر سکتا تھا جب کہ گلہری ہر قسم کی چھالیاں توڑ لیتی ہے۔ اس نظم کا آخری شعر ہے:-

نہیں ہے چیز نکمّی کوئی زمانے میں

کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں

اس نظم میں یہ بات سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ شیخی اور غرور سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ نظم ''ہمدردی'' ایک بلبل کے بارے میں ہے جو رات کے اندھیرے میں راستہ بھٹک جاتی ہے اور ایک ننھا سا جگنو اس کو راستہ دکھاتا ہے۔ اس نظم کا آخری شعر ہے:

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

نظم ''پرندے کی فریاد'' ایک ایسے پرندے کی کہانی ہے جو پنجرے میں قید ہے اور اپنے آشیانے کو یاد کر رہا ہے۔

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ
وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا

پھر وہ پرندہ اپنی آزادی کے دن یاد کر کے غم گین ہو جاتا ہے:-

جب سے چمن چھٹا ہے یہ حال ہو گیا ہے
دل غم کو کھا رہا ہے، غم دل کو کھا رہا ہے

ہندوستانیوں کے لیے پرندے کی یہ فریاد ایک پیغام تھی کیوں کہ جو کوئی بھی غلامی کی زنجیروں میں قید ہوتا ہے آزادی سے محروم ہو جاتا ہے۔

نظم ''جگنو'' میں بہت خوب صورت انداز میں فطرت (نیچر) اور دنیا کی مخلوق کا مقابلہ کیا گیا ہے:-

یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا
غربت میں آکے چمکا گمنام تھا وطن میں

کوئی چیز کتنی ہی چھوٹی ہو یا بڑی ہو اس کی انفرادیت یا اپنا پن بہت اہم ہوتا ہے۔ ہر چیز اور ہر

آدمی دوسروں سے مختلف ہوتا ہے لیکن اس کی اپنی الگ ایک اہمیت ہوتی ہے:

پروانہ اک پتنگا جگنو بھی اک پتنگا
وہ روشنی کا طالب یہ روشنی سراپا

اقبال نے 1899 میں "نالہ یتیم" نظم لکھی جو "بچے کی دعا" کے عنوان سے مشہور ہے۔ اس کے کچھ اشعار اس طرح ہیں:-

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری
دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے
ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت

یہ نظم اتنی مقبول ہوئی کہ اس کو مختلف اسکولوں میں صبح کی دعامیں ترانے کے طور پر گایا جانے لگا۔

اقبال کو اپنے ہندوستانی ہونے پر کتنا فخر ہے۔ نیچے لکھے دو شعر اس بات کو ظاہر کرتے ہیں:

پربت وہ سب سے اونچا ہم سایہ آسماں کا

وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا

غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں

سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا

یہ شاندار نظم اس صدی کی شروعات میں لکھی گئی تھی لیکن یہ ہمیشہ زندہ رہے گی۔ ساری دنیا کے لیے ایک پیغام دینے والی یہ نظم بچے بڑے سبھی پسند کرتے ہیں۔ اس نظم کو ہمارے ملک کے قومی ترانے کی طرح ہی اہمیت دی جاتی ہے۔

اقبال کی ایک بہت زبردست نظم "بانگِ درا" میں شامل ہے۔ اس نظم کے دو حصے ہیں۔ "شکوہ" اور "جوابِ شکوہ"۔ پہلے حصے میں اقبال خدا سے یہ شکایت کرتے ہیں کہ وہ مسلمانوں

پر کافی مہربان نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ ساری دنیا میں مسلمانوں کی حالت خراب ہے۔
جب ''شکوہ'' کی اشاعت ہوئی تھی تو لوگ کچھ بھڑک سے گئے لیکن جب اقبال نے جوابِ شکوہ نظم لکھی تو سب کی تسلی ہو گئی۔ اس دوسرے حصے میں اقبال مسلمانوں کی ایک سچی تصویر پیش کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ مسلمان بے عمل اور سست ہو گئے ہیں اور اللہ پر سچا یقین کھو بیٹھے ہیں۔ اس نظم کو پڑھ کر مسلمان اپنی کمزوریوں کی وجہ سے ڈر سے گئے۔ یہ نظم سیدھے سادے انداز میں، ابتدائی زمانے میں لکھی گئی تھی لیکن یہ ایک ایسی نظم ہے جو اقبال کی شاعری کو ایک نیا موڑ دیتی ہے۔ 'بانگِ درا' کے چھپنے کے بعد یہ بات مان لی گئی کہ اقبال اردو شاعری کو ایک ایک نیا راستہ دکھا رہے ہیں۔

عالمگیریت

اقبال کی اردو نظموں کا ایک نیا مجموعہ 'بالِ جبریل' کے نام سے 1935 میں شائع ہوا جس سے پتہ لگا کہ اقبال کی شاعرانہ صلاحیتیں ترقی کر کے نئی بلندیوں کو چھونے لگی ہیں۔ ان کی نگاہ بہت دور تک پہنچ رہی ہے اور فارسی الفاظ کے استعمال سے ان کا لکھنے کا انداز کچھ ایسا بن گیا ہے جو صرف ان ہی کا حصہ ہے۔
اقبال کی شاعری میں صرف اپنے وطن سے ہی محبت ظاہر نہیں ہوتی بلکہ اس میں ساری دنیا کے مسائل کا ذکر آتا ہے۔ وہ ساری دنیا کے انسانوں کو ایک گروہ سمجھ کر سوچتے تھے اور سب میں دل چسپی لیتے تھے۔ اسی کتاب میں ایک نظم ''مسجدِ قرطبہ'' شامل ہے۔ یہ مسجد اسپین کے شہر قرطبہ میں اس زمانے میں بنائی گئی تھی جب مسلمان اسپین پر حکومت کرتے تھے۔ بڑے فنکارانہ انداز سے اس نظم میں اسلام کی عظمت اور اس کے زوال کی تصویر کھینچی گئی ہے۔

اپنی ایک نظم ''لینن خدا کے حضور میں'' اقبال کمیونزم کے اچھے برے پہلوؤں پر بحث کرتے نظر آتے ہیں۔ اس نظم سے پتہ چلتا ہے کہ ان کو اپنے زمانے کے سیاسی فلسفے کا پورا شعور تھا۔

''ساقی نامہ'' مثنوی کے انداز میں لکھی ہوئی ایک کافی لمبی نظم ہے۔ اس میں ملک کے زوال اور ایشیا میں پیدا ہو رہی بیداری کی لہر کو دکھایا گیا ہے۔ 'بالِ جبریل' میں شامل ایک اور مشہور نظم، پچھڑے ہوئے لوگوں کو اس بات پر اکساتی ہے کہ وہ سرمایہ داری نظام کے خلاف

انقلاب برپا کردیں

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روئی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اسی نظم کا ایک اور شعر اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جلد ہی جمہوریت کا ایک نیا دور آئے گا:

آزادئ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

اقبال کی اردو شاعری کا ایک اور مجموعہ 'ضربِ کلیم' 1936 میں شائع ہوا۔ اس کتاب میں ایک جگہ مسلمانوں کی نماز کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

اس کتاب میں عورتوں کے مقام کا بھی ذکر کیا گیا ہے:

مکالماتِ فلاطون نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطون

یعنی عورت افلاطون کی طرح مضامین تو نہیں لکھ سکی لیکن افلاطون کا جادو اسی نے توڑا۔

صوفیانہ رنگ

"اسرارِ خودی' میں انسان کی شخصی زندگی اور خودی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ دنیا کا یہ نظام خودی (اپنی ذات کی اہمیت) سے ہی پیدا ہوا اور اسی خودی کی طاقت کی وجہ سے زندگی آگے بڑھتی رہتی ہے۔ ان کے مطابق تمنا یعنی کچھ حاصل کرنے کی خواہش زندگی کا سرچشمہ اور محبت سے خودی کو طاقت ملتی ہے۔ 'رُموزِ بے خودی' میں اجتماعی زندگی' سماجی نظام اور نئے معنی میں قومیت کی روح دکھائی دیتی ہے۔ اس کتاب میں سماج کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔

اقبال کا یقین ہے کہ ایک خاص حد کے بعد ذاتی فائدے کو سماج کے فائدے کے لیے قربان کر دینا چاہیئے۔

'اسرارِ خودی' اور 'رموزِ بے خودی' میں بظاہر مسلمانوں کو مخاطب کیا گیا ہے لیکن ان کتابوں میں ساری دنیا کے لوگوں کے لیے ایک معنی اور ایک پیغام پوشیدہ ہے اور ساری دنیا سے ان کا تعلق ہے۔ بڑے اچھے طریقے سے خودی اور بے خودی کے موضوعات پر ان کتابوں میں لکھا گیا ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ فرد سے ہی ترقی کی راہ ہموار ہوتی ہے۔

"پیامِ مشرق" گوئٹے کی تصنیف "The West astlicher Divan" سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے، جس میں اس بات پر افسوس ظاہر کیا گیا تھا کہ مغربی دنیا میں بے حسی پائی جاتی ہے اور وہاں کے لوگوں نے روحانیت کو کھو دیا ہے۔ اقبال نے مشرق کو دعوت دی ہے کہ وہ مغربی دنیا کو روحانی جوش، پیار، ایمان اور یقین کی دولت دیں۔ اس نظم میں انسان کے اندرونی شعور یعنی 'ضمیر'، انسانوں سے محبت اور خدا سے محبت پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اقبال مغربی دنیا کو نصیحت کرتے ہیں کہ وہ زندگی میں ظاہری خوشیوں کے ساتھ ساتھ اندرونی قوتوں کو ترقی دینے کی طرف بھی دھیان دیں۔

"زبورِ عجم" میں مشرق کے وہ نغمے شامل ہیں جو انسان کے دل پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ اس تصنیف کے پہلے حصے میں شاعر خدا سے خطاب کرتا ہے، دوسرے حصے میں انسان کی باتیں کرتا ہے اور تیسرے حصے میں فطرت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔

جاوید نامہ

"جاوید نامہ" کا مقصد خاص طور پر نوجوانوں کو بیدار کرنا ہے۔ اس میں زندگی کے مسئلوں اور دنیا کی طاقتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اقبال کے چھوٹے بیٹے کا نام جاوید تھا۔ "جاوید" اس نظم میں نئی نسل کی نمائندگی کرتا ہے۔

شاعر اقبال، مولانا جلال الدین رومی کے ساتھ آسمان کی سیر کرتا ہے۔ "زروان" جو وقت اور مقام کی علامت یا نشانی ہے، ان دونوں مسافروں کو وقت اور مقام کی قید سے آزاد کر دیتا ہے۔ شاعر ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں ستارے نغمے گا گا کر آسمان میں شاعر کا استقبال

کرتے ہیں۔ اقبال چاند تک پہونچتے ہیں جہاں پر ایک ہندوستانی سنت ان کی زندگی کے راز بتاتا ہے اور یہ پیش گوئی کرتا ہے کہ مشرق بہت ترقی کرے گا۔ شاعر 'یرغمدِ' کی وادی میں پہنچتا ہے جہاں وہ مہاتما بدھ، زرتشست، عیسیٰ مسیح اور حضرت محمد کی تعلیمات سے واقفیت حاصل کرتا ہے۔

اقبال کی ملاقات مشتری ستارہ پر، سید جمال الدین افغانی اور سید حلیم پاشا سے ہوتی ہے۔ شاعر ان کو بتاتا ہے کہ ترکستانی، ایرانی اور عرب لوگ کس طرح یوروپ سے مرعوب ہو گئے ہیں۔ جلال الدین رومی سرمایہ داری اور فرقہ وارانہ جذبات پر نکتہ چینی کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ دنیا کو اب ایک تبدیلی کی ضرورت ہے۔

جب شاعر ستارہ زہرا پر پہنچتا ہے تو وہ ایک ایسی ندی کے نیچے پہنچ جاتا ہے جہاں پر مغرور فرعون رہتے ہیں۔ وہ فرعون اس بات پر افسوس ظاہر کرتے ہیں کہ انھوں نے مذہب کی دولت اپنے ہاتھ سے کھودی۔ زحل پر اقبال ایسے لوگوں کو دیکھتے ہیں جو سائنس کا بہت علم رکھتے ہیں۔ اُن پر اُن کے دل کی بجائے ان کے دماغوں کی حکومت ہوتی ہے۔ اس موقع پر ان کے ایسے اشعار ملتے ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ "اگر ایک قسم کی قسمت ترا ساتھ نہیں دیتی تو خدا سے دوسری قسمت مانگ لے۔" اور "اس بات میں سچائی چھپی ہے کہ اگر تو بدلتا ہے تو تیری قسمت بھی بدل جائے گی۔"

جو پیٹر (Jupiter) ستارے پر اقبال کی ملاقات غالب، ایرانی شاعرہ طاہرہ اور صوفی منصور حلاج سے ہوتی ہے۔ اقبال بنگال کے غدار میر جعفر اور دکن کے غدار صادق جیسے لوگوں کو سینچر (Saturn) ستارہ پر پاتے ہیں۔ کیوں کہ دوزخ نے بھی ان کو اپنے اندر داخل نہیں ہونے دیا تھا۔

آسمانوں سے پرے اقبال کی ملاقات نطشے، ملا طاہر غنی کشمیری، بھرتری ہری، نادر شاہ ابدالی اور ٹیپو سلطان سے ہوتی ہے۔ نوجوانوں کے لیے ٹیپو سلطان کا پیغام تھا "شیر کی زندگی کا ایک لمحہ کسی بھیڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔" جاوید کو مخاطب کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں "انسانوں کا احترام کرنا انسانیت کی روح ہے اس لیے انسان کا احترام کرنا سیکھو۔"

خودی

اقبال کی نظمیں جگنو، گلہری، مکڑی اور مکھی جیسے معمولی جانداروں کے بارے میں بھی ہیں اور "اسرارِ خودی"، "رموزِ بے خودی" جیسی فلسفیانہ نظمیں بھی ہیں۔ کچھ نظموں میں انھوں نے "شاہین" (عقاب) کو ہمت کی علامت بنایا ہے۔ نظمیں چاہے جس طرح کی ہوں ان سب میں اقبال کا خودی بے خودی اور ذاتی آزادی کا فلسفہ ہو جگہ دکھائی دیتا ہے۔ اقبال نے خودی کے بارے میں ایک اپناہی فلسفہ بنایا تھا۔ جس کی تعریف مندرجہ ذیل شعر میں ملتی ہے:

یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے
خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے

کائنات کی تخلیق یا ساری دنیا کی پیدائش کا سلسلہ انفرادی وجود سے شروع ہوا، جس کو اقبال "وجودِ بسیط" کہتے ہیں۔ "وجودِ بسیط" میں ادراک اور سوجھ بوجھ اور احساس کی بہت سی قوتیں پوشیدہ ہوتی ہیں جن کو کام میں لانے کے لیے وجود دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ ایک خودی اور دوسرا بے خودی۔ اقبال خودی کی تعریف بہت واضح الفاظ میں کرتے ہیں:

خودی کو کر اتنا بلند کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

انسان کی انفرادیت یعنی ذات، ترقی کرتے کرتے سب سے اونچے مقام تک پہونچ جاتی ہے۔ انسان کا جسم تو زمانے اور مکان کی حدوں میں قید رہتا ہے، لیکن خودی اس قسم کی حدوں سے آزاد ہوتی ہے۔ خودی کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک ذاتی اور بے مثالی چیز ہے۔

انسان کی ترقی کے تین پہلو ہوتے ہیں۔ پہلا ذاتی آزادی، دوسرا ذات کا زندۂ جاوید ہونا اور تیسرا پہلو ہے انسان کا صحیح معنوں میں انسان بننا۔ انسان کی شخصیت کو محبت، ہمت، قوتِ برداشت اور حلال روزی سے تقویت ملتی ہے۔ محبت ایک ایسی طاقت ہے جو کائنات کو رواں دواں رکھتی ہے۔ اور مثبت ہی ایک ایسا جذبہ ہے جس سے انسانی ذہن میں اچھے خیالات پیدا ہوتے ہیں اور خوب صورت چیزوں کی تخلیق ہوتی ہے۔

اقبال نے ایک اور لفظ 'فقر' اپنی شاعری میں کافی استعمال کیا ہے۔ فقر کا مطلب ہے کہ انسان

دنیاوی مال و دولت سے پوری طرح بے نیاز ہو جائے۔ جس شخص کے اندر فقر کی خوبی ہوگی وہ ''فقیر'' کہلائے گا اور ایک فقیر کبھی بھی کوئی کام خود غرضی کی بنا پر نہیں کرتا۔

مرا طریق امیری نہیں، فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

اقبال کی شاعری میں ''شاہین'' ایک مشہور علامت بن گیا ہے۔ دراصل یہ شاہین خود اقبال ہیں۔ ایک شاہین تمام مشکلوں سے لڑتے ہوئے اور تمام رکاوٹوں کو دور کرتے ہوئے اپنی منزل تک پہنچ جاتا ہے:

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے واسطے آسماں اور بھی ہیں

شاہین بلندیوں پر بسیرا کرتا ہے اور ان چیزوں کو ڈھونڈ لیتا ہے جو دور سے دکھائی بھی نہیں دیتیں۔

تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

اقبال کے مزاج میں بہت زیادہ قناعت تھی۔ ان کی شاعری میں شاہین کی علامت قناعت کے لیے بھی استعمال کی گئی ہے۔

اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعہ یہ بھی تعلیم دی ہے کہ مضبوط ایمان رکھنے والے انسان میں زبردست قوت برداشت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اپنے ایک شعر میں وہ کہتے ہیں کہ ''انسانیت کا مطلب یہی ہے کہ ہر انسان کا احترام کیا جائے۔ آدمی کو انسان کی عظمت کی بات ضرور سیکھنی چاہیے''۔

اقبال ''کسبِ حلال'' یعنی حلال روزی میں یقین رکھتے تھے اور اس بات کو مانتے تھے کہ اس دنیا میں کچھ حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں انھوں نے جو ایک شعر کہا ہے۔ اس کا مطلب ہے ''اس بات پر تجھے شرم آنی چاہیے کہ تجھے کوئی ہیرا اپنے آباء و اجداد یا بزرگوں سے ورثے میں ملے۔ اس طرح ہیرا پانے میں وہ لطف نہیں ملتا جو ہیرے کو ہیرے کی کان سے نکالنے میں ملتا ہے۔''

''ارمغانِ حجاز'' اقبال کا آخری مجموعہ کلام تھا جو ان کی موت کے بعد شائع ہوا۔ اس مجموعے

میں زیادہ تر اللہ سے محبت اور تصوّف سے متعلق خیالات پائے جاتے ہیں۔

اقبال نے اپنی شاعری میں انسانی صلاحیتوں میں یقین، انسان کی لامحدود ترقی اور کائنات میں اس کی بے مثال حیثیت کا ذکر اکثر کیا ہے۔ ان ہی خوبیوں کی وجہ سے اقبال کی شاعری میں فن کی عظمت پائی جاتی ہے۔

وطن سے محبت اور سماج کے موضوعات پر اس قسم کی شاعری اس وقت کچھ نئی قسم کی شاعری تھی۔ ان موضوعات کا تعلق اقبال کے زمانے سے تھا لیکن ان میں عالمگیریت بھی پائی جاتی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی شاعری ہمیشہ کے لیے تھی اور ہر ملک کے لیے تھی۔ اس عظیم فن کار نے ان موضوعات کو بڑی احتیاط اور بڑے اچھے ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔

اقبال کی شاعری میں پرانی روایات اور نئی علامات کا ایک بہت اچھا سنگم دکھائی دیتا ہے۔ اقبال نے ان موضوعات پر بہت عمدگی کے ساتھ قلم اٹھایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کو پڑھنے والے ان کے کلام سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور ان کو کچھ سیکھنے سمجھنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ اقبال اپنی شاعری میں جو زبان استعمال کرتے ہیں۔ وہ رواں دواں اور نغمگی سے بھرپور ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تصویریں کھینچیں ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ان کی زبان بہت موزوں ہے۔ اس لیے ان کا مقابلہ ورڈس ورتھ، شیلی اور ملٹن سے کیا جاسکتا ہے۔ برِصغیر (ہندوپاک) کے بہت سے شاعر اقبال سے بے حد متاثر ہوئے اور ان کی شاعری کو اقبال سے تحریک ملی۔ ان شاعروں میں جوش ملیح آبادی، ترلوک چند محروم، پنڈت برج نارائن چکبست، روش صدیقی، سیماب اکبر آبادی، سردار جعفری اور رفعت سروش کا نام لیا جاسکتا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک پُر سکون سنجیدہ اور خوشیوں سے بھرپور مستقبل کے لیے کام کیا جائے۔ اس سلسلے میں اقبال کے مندرجہ ذیل شعر میں ہمیں ایک عظیم پیغام ملتا ہے:

یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو
ہر شے میں جب کہ پنہاں خاموشیٔ ازل ہو

بھولا بھائی ڈیسائی

سرلا جگ موہن

اب ایک فوجی جدوجہد بغیر کام نہیں چلے گا۔ ہندوستان کی آزادی کی آخری جنگ شروع ہو چکی ہے۔ آزاد ہند فوج کے سپاہی اب ہندوستان کی سرزمین پر مستعدی کے ساتھ لگاتار آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ اور تمام دقتوں اور رکاوٹوں کے باوجود آہستہ آہستہ مگر پورے استحکام سے اُن کے قدم بڑھ رہے ہیں۔

فوجی جدوجہد جاری رہے گی......................

"راشٹر پتا! ہندوستان کی آزادی کی اس مقدس جنگ میں ہمیں آپ کی نیک خواہشات اور دعاؤں کی ضرورت ہے۔"

سبھاش چندر بوس

(آزاد ہند ریڈیو سے براڈکاسٹ)

6ر جولائی 1944

بھولا بھائی ڈیسائی

بھولا بھائی ڈیسائی ہندوستان کی آزادی کی جنگ لڑنے والے ممتاز قومی رہنماؤں میں سے ایک تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ ایک چوٹی کے وکیل بھی تھے۔ انھوں نے چالیس سال تک وکالت کی اور بے اندازہ پیسہ کمایا۔

یہ عظیم سیاستداں اور وکیل گجرات میں ولساد کے مقام پر 13/اکتوبر 1877 کو پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد کا نام جیون جی تھی۔ وہ ایک معمولی سرکاری وکیل تھے۔ لیکن ان کو اجازت ملی ہوئی تھی کہ وہ پرائیوٹ طور پر بھی وکالت کر سکیں۔ ان کی ماں رمابائی ایک سیدھی سادی عورت تھیں۔ جنھوں نے کسی اسکول میں تعلیم حاصل نہیں کی تھی مگر ان کی طبیعت کا جھکاؤ مذہب کی طرف بہت زیادہ تھا۔ جیون جی کو پرائیوٹ طور پر وکالت کرنے سے اچھی خاصی آمدنی ہوجایا کرتی تھی۔ اس آمدنی سے انھوں نے کچھ زمین بھی خریدلی تھی جس پر انھوں نے الفانسو نسل کے آموں کا ایک باغ لگالیا تھا۔ زمین کے کچھ حصہ پر دھان کی کھیتی ہوتی تھی۔

بھولا بھائی اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھے۔ اس لیے ان کو بہت لاڈ پیار ملتا تھا لیکن اپنے ماموں کے گھر سے اسکول پہنچنے کے لیے انھیں ہر روز کئی میل پیدل ہی چلنا پڑتا تھا۔ بعد میں انھوں نے ولساد میں، ''اوابائی اسکول''میں تعلیم حاصل کی پھر وہ بمبئی کے بھارداہائی اسکول میں داخل ہوئے اور وہیں سے انھوں نے 1895 میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ میٹرک کے امتحان میں وہ اپنے اسکول میں فرسٹ آئے۔

میٹرک کرنے کے بعد انھوں نے بمبئی میں ایلفنسٹن کالج میں داخلہ لے لیا اور دوسری زبان کی حیثیت سے فارسی پڑھی۔ تاریخ اور انگریزی ادب کے ساتھ انھوں نے فرسٹ ڈویژن سے بی۔ اے پاس کیا۔ تاریخ اور سیاسی معاشیات (پولیٹیکل اکانومی) میں فرسٹ آنے کی وجہ سے ان کو ''ورڈس ورتھ'' پرائز بھی ملا اور وظیفہ بھی۔ اپنے والد کی بیماری کی وجہ سے وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے ولایت نہیں جاسکے اس لیے بمبئی یونی ورسٹی سے انھوں نے انگلش میں ایم۔ اے کیا۔

جب بھولا بھائی اسکول میں پڑھتے تھے تب ہی اِچھا بین سے ان کی شادی کردی گئی۔ ان کے بس ایک ہی لڑکا تھا جس کا نام دھیرو بھائی تھا۔ 1923 میں اچھا بین کینسر کا شکار ہو گئیں۔

احمد آباد کے گجرات کالج میں بھولا بھائی کو انگریزی ادب اور تاریخ کے پروفیسر کی حیثیت سے ملازمت مل گئی۔ اپنی ملازمت کے دوران ہی وہ وکالت کے امتحان کی تیاری کرتے رہے۔ یہ وکالت کے پیشے کی طرف ان کا پہلا قدم تھا جس میں آگے چل کر انھوں نے بڑا نام کمایا۔ ان کے والد کی خواہش تھی کہ بھولا بھائی یا تو ایک وکیل بنیں یا پھر سرکاری افسر! بھولا بھائی نے اپنے والد کی یہ خواہش پوری کر دکھائی۔

وکالت کی ابتدائی زندگی

1905 میں بھولا بھائی ڈیسائی کو بمبئی ہائی کورٹ میں ایڈوکیٹ بننے کا لائسنس مل گیا اور اس کے بعد تو انھوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا ہی نہیں۔ وہ قانون کے اصولوں کو بہت اچھی طرح سمجھتے تھے۔ مقدمات لڑانے میں خوب محنت کرتے تھے اور پھر ان میں صلاحیت بھی بہت تھی۔ اس لیے انھوں نے قانون کے میدان میں اپنا ایک مقام بنالیا۔ وہ روانی کے ساتھ بولتے تھے اور فوراً معاملہ کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے۔ وہ زبردست یادداشت کے مالک تھے اور اپنی خوش مزاجی سے سب کا من موہ لیتے تھے۔ ان خوبیوں کی بنا پر جب وہ ایک جونیئر وکیل تھے تب بھی پیچیدہ سے پیچیدہ مقدمے لڑا لیا کرتے تھے اور کمال کی بات یہ تھی کہ جب وہ بحث کرتے تھے تو ان کے ہاتھ میں پہلے سے لکھے ہوئے نکتوں کا کوئی کاغذ تک نہیں ہوتا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب بمبئی ہائی کورٹ کے چیف جسٹس لارنس جینکنس نے وکیلوں کی بار (Bar) میں ہندوستانیوں کو شامل کرنے کی شروعات کی تھی۔ بمبئی کے کئی مشہور وکیل جیسے جے۔ پی کانگا، کے۔ ٹی۔ تیلانگ اور بدرالدین طیب جی پہلے ہی بار میں شامل کر لیے گئے تھے۔ اب ابھرتے ہوئے نوجوان ایڈوکیٹ بھولا بھائی کی باری تھی۔ 1927 میں ایک وکیل کی حیثیت سے سارے ہندوستان میں ان کا نام پھیل گیا۔ کے۔ ایم منشی اور ایچ۔ آئی کانیا بھی ان دنوں مشہور اور کامیاب وکیل تھے لیکن یہ دونوں بھولا بھائی ڈیسائی کے جونیئر تھے۔ اور ان کے ساتھ رہ کر ان کی رہنمائی میں کام کرتے تھے۔

بھولا بھائی نے وکالت کے پیشے میں بہت کامیابی حاصل کی۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے ملک کی عظیم خدمت بھی کی اور وہ اس طرح کہ سیاسی آزادی کی لڑائی میں شامل ہندوستانیوں پر عدالتوں میں جو مقدمے چلتے رہتے تھے، بھولا بھائی ان میں قانونی طور پر مدد دیتے تھے۔ اس طرح سیاست کے دھارے میں ان کا شامل ہو جانا ایک قدرتی بات تھی۔ اینی بیسینٹ ان دنوں ہوم رول لیگ کی قیادت کر رہی تھیں اور انھوں نے اس لیگ میں، مختلف قسم کے سیاسی نظریات رکھنے والے کچھ عظیم لوگوں کو شامل کر لیا تھا۔ بال گنگادھر تلک، محمد علی جناح اور مشہور جرنلسٹ بی۔ جی ہارنی مین ان لوگوں میں شامل تھے۔ کچھ عرصہ تک بھولا بھائی ڈیسائی بھی ہوم رول لیگ کے سرگرم ممبر رہے۔

یہ ان کی سیاسی زندگی کی شروعات تھی۔ اس کے بعد وہ لبرل پارٹی میں شامل ہو گئے اور کئی سال تک اس میں رہے۔ 1928 میں برطانوی سرکار نے سائمن کمیشن مقرر کیا تھا جس میں سارے کے سارے یوروپین ممبران شامل تھے۔ اس کمیشن کا مقصد ہندوستان میں آئندہ ہونے والی دستوری اصلاحات کے بارے میں رپورٹ تیار کرنا تھا۔ بھولا بھائی ڈیسائی نے اس کمیشن کی مخالفت کی۔ ان کے خیال سے ہندوستان کی بری اور بحری فوج (نیوی) میں ہندوستانیوں کو شامل کرنا، انڈین سول اور ایڈمنسٹریٹو سروس کے معاملہ سے بھی زیادہ اہم بات تھی۔ 1934 میں جب وہ سنٹرل لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر تھے تو انھوں نے کانگریس پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے بھی یہ بات کہی تھی۔

1928 میں باردولی ستیہ گرہ کی کامیابی کے بعد بمبئی سرکار نے اس معاملہ میں تحقیقات کا حکم

دیا تھا۔ بھولا بھائی ڈیسائی کا اس تحقیقات سے کافی گہرا تعلق تھا۔ باردولی ستیہ گرہ کا مقصد یہ تھا کہ گجرات کے کسانوں پر ٹیکس نہ لگایا جائے۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل نے اس ستیہ گرہ کی قیادت کی تھی۔ ہندوستان کی ستیہ گرہ کی تاریخ میں باردولی ستیہ گرہ کا ایک اہم مقام ہے۔

گاندھی جی چاہتے تھے کہ کسانوں کا مقدمہ ایک بہترین ایڈوکیٹ چلائے۔ بھولا بھائی ڈیسائی کو اس کام کے لیے چنا گیا کیوں کہ وہ خود سورت ضلع کے تھے، اور وہاں کے کسانوں کے حالات اور مشکلات کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ دوسری طرف وہ مال گزاری کے معاملہ میں کافی تجربہ بھی رکھتے تھے۔

بھولا بھائی ڈیسائی نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ کسانوں کی مانگوں کی حمایت کی۔ آخر کار حکومت کو یہ بات ماننی پڑی کہ کسانوں پر لگنے والی مال گزاری (ٹیکس) کو کم کر دیا جائے، ان کی ضبط کی گئی زمین ان کو واپس کر دی جائے اور گرفتار کیے گئے ستیہ گرہیوں کو چھوڑ دیا جائے۔

بھولا بھائی ڈیسائی کی ان کوششوں اور تحقیقات کا یہ نتیجہ نکلا کہ گجرات میں کسانوں پر لگنے والی مال گزاری کم کر دی گئی۔ ساتھ ہی ساتھ پنجاب اور سنٹرل پراونسیز (موجودہ مدھیہ پردیش) میں بھی مال گزاری کم کر دی گئی۔ اس تجربے سے بھولا بھائی ڈیسائی کو ہندوستان کے معاشی مسئلوں کو سمجھنے کا زیادہ اچھا موقعہ ملا اور ان کی زندگی میں ایک نیا موڑ آگیا۔ وہ گاندھی جی اور کانگریس سے اور زیادہ قریب ہو گئے۔

کانگریس میں شمولیت

1930 میں بھولا بھائی ڈیسائی نے لبرل پارٹی سے استعفیٰ دے دیا اور باقاعدہ طور پر کانگریس میں شامل ہو گئے۔ باہر کے ملکوں میں بنی ہوئی چیزوں کے بائیکاٹ کو وہ صحیح سمجھتے تھے۔ اس لیے انھوں نے بمبئی میں "سودیشی سبھا" شروع کر دی۔ انھوں نے سوتی کپڑا تیار کرنے والے 80 کارخانوں کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ سودیشی سبھا میں شامل ہو جائیں۔ بعد میں ان کے اس اقدام کو حکومت نے غیر قانونی قرار دیا۔

1931 میں کراچی میں ہونے والے کانگریس کے اجلاس میں ایک کمیٹی بنائی گئی تھی جس کا

مقصد یہ پتہ لگانا تھا کہ ہندوستان کے مالی معاملات میں برطانیہ کے لیے ہندوستان کی کیا ذمہ داریاں ہیں۔ بھولا بھائی ڈیسائی اس کمیٹی کے ممبر تھے۔ کمیٹی نے حکومت برطانیہ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی لین دین کا حساب دیکھا اور ہندوستان کے عوامی قرضہ کے معاملہ پر بھی غور کیا۔ کمیٹی نے اس رپورٹ کا بھی مطالعہ کیا جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ آئندہ زمانہ میں ہندوستان کو کن کن مالی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانا پڑے گا۔ کمیٹی نے یہ پتہ لگالیا کہ "عوامی قرضہ" خالص ہندوستان کے فائدہ کے لیے نہیں ہے۔ چناں چہ یہ آواز اٹھائی گئی کہ جب عوامی قرضہ کی رقم سے ہندوستان کے علاوہ دوسروں کو بھی فائدہ پہنچتا ہے تو صرف ہندوستانی یہ بوجھ کیوں اٹھائیں۔

سودیشی سبھا کا کام کرنے کی وجہ سے 1932 میں بھولا بھائی ڈیسائی کو گرفتار کرلیا گیا۔ ان کی گرفتاری پر ناراضگی ظاہر کرنے کے لیے اس دن سوتی کپڑے، سونے اور شیئر کے بازار بند رہے۔ اس سے پہلے حکومت نے ان سے یہ بتانے کے لیے کہا تھا کہ کانگریس سے ان کا تعلق کس طرح کا تھا۔ اور اس سلسلہ میں پولیس ان کی سخت نگرانی کرتی رہی تھی۔ گرفتار ہونے کے بعد ان کے ساتھ 'اے' کلاس قیدی کا سلوک کیا گیا اور جیل میں ان کو بہت سی رعایتیں بھی دی گئیں۔

جیل میں رہ کر بھولا بھائی ڈیسائی نے بھگوت گیتا کے علاوہ قانون اور کئی دوسرے موضوعات پر بہت سی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ جیل سے باہر کی دنیا سے ان کا تعلق ختم ہوگیا تھی۔ اور اس بات کا ان کے دل پر اثر بھی تھا۔ اپنے بیٹے کو بھیجے گئے ایک خط میں انھوں نے یہ لکھا تھا۔ "جب میں باہر تھا تو میری طبیعت میں امنگ رہتی تھی۔ جیل میں تو بس وہی اکتا دینے والی روزمرہ کی زندگی ہے یا پھر یہ کام ہے کہ خالی اور بے جان دیواروں کو تکتے رہو۔"

گاندھی جی کے ساتھ رہ کر، زندگی اور خاص طور پر سیاست کے بارے میں بھولا بھائی ڈیسائی کے خیالات پر کافی گہرا اثر پڑا۔ انھوں نے اپنی جیل کی زندگی کو "ہندوستان کی آزادی کی لڑائی میں ایک قدم" سمجھا۔

بھولا بھائی ڈیسائی اس وقت جیل میں ہی تھے جب حکومت نے 1932 میں "کمیونل اوارڈ"

(فرقہ واری اوارڈ) کا اعلان کیا۔ اس اسکیم کے تحت لیجسلیٹو اسمبلی میں، پچھڑے ہوئے طبقوں کے لوگوں کو کچھ خصوصی سیٹیں ملنی تھیں۔ گاندھی جی نے برطانوی وزیر اعظم ریمز ے میکڈ انلڈ کو اطلاع دی کہ اگر یہ خصوصی رعایت واپس نہیں لی گئی تو وہ بھوک ہڑتال شروع کر دیں گے۔

اس معاملہ پر ڈاکٹر امبیڈکر اور کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ صلاح مشورہ ہوا۔ آخر کار 'پونا سمجھوتہ' کے تحت ایک فیصلہ ہوا اور عام انتخابی حلقوں کے اندر پچھڑے طبقوں کے لوگوں کے لیے کچھ زیادہ سیٹیں ریزرو کر دی گئیں۔

بھولا بھائی ڈیسائی جب تک جیل میں رہے مستقل بیمار رہے۔ صحت کی خرابی کی وجہ سے ان کو جیل سے رہا کر دیا گیا اور وہ اپنے علاج کے لیے یوروپ چلے گئے۔ ان کی واپسی کے تھوڑے ہی دن بعد کانگریس ورکنگ کمیٹی کی نئی تشکیل ہوئی اور سردار ولبھ بھائی پٹیل کے کہنے پر بھولا بھائی ڈیسائی کو اس میں شامل کر لیا گیا۔ کچھ عرصہ پہلے، مارچ 1933 میں ایک وہائٹ پیپر (قرطاس ابیض) کے ذریعہ ایک راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کرنے کا فیصلہ ہوا تھا۔ اس کانفرنس کے نتیجے میں 1935 میں "انڈیا ایکٹ" پاس ہوا اور اس قانون کے تحت ہندوستانیوں کو صوبوں میں اپنی خود مختار حکومتیں قائم کرنے کا اختیار دے دیا گیا۔

اس اہم موڑ پر لیجسلیٹو اسمبلیوں میں کانگریس کے شامل ہونے کا سوال ابھرا اور طے پایا کہ کانگریس اسمبلیوں میں شامل ہوگی۔ اس پالیسی کو اپنانے میں بھولا بھائی ڈیسائی کا کافی ہاتھ تھا۔

کانگریس کے لیجسلیٹو اسمبلیوں میں شامل ہونے کے فیصلہ سے خود بہت سے کانگریسی ناخوش تھے لیکن بھولا بھائی ڈیسائی سیاست میں ہمیشہ سے نرم رویہ کے قائل تھے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ "اس طرح کا فیصلہ کیا ہندوستان کے مکمل آزادی حاصل کرنے کے مقصد کے لیے فائدہ مند ہے؟" تو انھوں نے جواب دیا کہ وہ کسی ایسے طریقہ کی حمایت نہیں کر رہے جو 'بے دلی کے ساتھ' اپنایا گیا ہو۔ ان کی رائے میں "کسی گرم لڑائی میں شامل ہونے کے مقابلہ میں کوئی ایسا کام کرنے میں زیادہ بہادری ہے جو [illegible] پھیکا دکھائی دیتا ہو۔"

انھوں نے کہا تھا کہ "میں آزادی کی لڑائی میں ایک جذباتی نوجوان کی طرح شامل نہیں ہوا تھا۔..... میں عوام کا آدمی ہوں...... اس لیے میں خود عوام ہوں...... میں عوام کے جذبات کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ اسی لیے میرے خیالات عوام کے ذریعہ، عوام کے لیے اور عوام کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔"

وہ اس بات میں یقین رکھتے تھے کہ ہندوستان والوں کو ایک طرف سماجی اور مذہبی رسم و رواج کے غلبہ کی وجہ سے اور دوسری طرف غیر ملکی قوموں کے غلبہ کی وجہ سے تکلیفیں اٹھانی پڑ رہی تھیں۔ وہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ سماجی اور مذہبی رسم و رواج کے خلاف لڑ کر ہندوستان غیر ملکی قوموں کی غلامی سے آزاد ہونے کی منزل سے زیادہ قریب ہو سکتا ہے۔

مرکزی لیجسلیٹو اسمبلی میں شمولیت

1934 میں گجرات سے بھولا بھائی ڈیسائی کو مرکزی لیجسلیٹو اسمبلی کے لیے چن لیا گیا۔ اسمبلی میں انھوں نے بڑی ہوشیاری، وقار اور ذمہ داری کے ساتھ، اپنی پارٹی کی قیادت کا مشکل کام چلایا۔ انھوں نے خود اپنی پارٹی اور مخالف پارٹی کے ممبروں کے دل میں عزتِ نفس اور خود اعتمادی کا احساس پیدا کیا۔ وہ بڑی عمدہ زبان میں روانی کے ساتھ بولتے تھے اور ان میں یہ صلاحیت تھی کہ اپنی بات سے دوسروں کو مطمئن کر دیتے تھے۔ ان خوبیوں کی وجہ سے پہلے ان کو قانونی عدالتوں میں کامیابی ملی تھی اور اب لیجسلیٹو اسمبلی میں بھی ان خوبیوں کی وجہ سے ان کو بہت مدد ملی۔

بھولا بھائی ڈیسائی کے مرکزی لیجسلیٹو اسمبلی کے اجلاس میں پہلی بار شریک ہونے سے لوگوں نے بہت سی امیدیں باندھ لی تھیں۔ اس موقعہ پر کانگریس کے ممتاز رہنما بھی موجود تھے۔ ان سبھی کی امیدیں پوری ہوئیں۔ بھولا بھائی ڈیسائی کی قیادت میں کانگریس پارٹی نے ایک ٹیم کی طرح مل جل کر کام کیا۔ کسی بحث میں وہ اسی وقت دخل اندازی کرتے تھے جب اس کی واقعی ضرورت ہوتی تھی۔ جب کبھی انھیں بولنا پڑتا تھا وہ بڑے پُر جوش اور زوردار ڈھنگ سے بولتے تھے لیکن کبھی بھی سخت الفاظ استعمال نہیں کرتے تھے۔

وہ اس بات میں گہرا یقین رکھتے تھے کہ اپنے سیاسی اور معاشی مفادات کی وجہ سے ہی کسی قوم

کے لوگوں میں سچی بیداری پیدا ہوتی ہے۔ وہ مذہب کو عوامی معاملات سے الگ ہی رکھتے تھے۔ ان کے خیال سے مذہب کا معاملہ تو "انسان اور خدا کے درمیان" ہوتا ہے۔

مرکزی لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبران بھولائی بھائی ڈیسائی کی شخصیت، ان کی ملنسار طبیعت اور ان کی اعلیٰ درجہ کی ذہانت سے بہت متاثر تھے۔ جس دن ان کو بولنا ہوتا تھا اس دن اسمبلی میں مشکل سے ہی کوئی سیٹ خالی دکھائی دیتی تھی۔ ان کا یہ کمال تھا کہ وہ لوگوں پر جادو سا کر دیتے تھے اور ہر قسم کے خیالات رکھنے والوں کی اپنی بات سے مطمئن کر دیتے تھے۔ وہ خود ہر طرح سے عوام کے کام آتے تھے۔ خود ان کے پاس جا کر ان سے ملتے جلتے رہتے تھے۔ اس لیے وہ عوام میں خیر خواہی کے جذبات پیدا کر دیتے تھے۔ وہ ایک انتہائی باصلاحیت پارٹی لیڈر تھے اور سبھی ان کو پسند کرتے تھے۔ حالاں کہ اسمبلی میں وہ کسی پر کوئی روک ٹوک نہیں لگاتے تھے پھر بھی کوئی یہ ہمت نہیں کرتا تھا کہ ان کے ساتھ بے تکلف ہو جائے۔

اس زمانہ میں ہندوستان پر سرکش اور گستاخ قسم کے برطانوی حکمراں حکومت کرتے تھے۔ ایسے ماحول میں کسی کے لیے مخالف لیڈر ہونا ایک ٹیڑھا کام تھا۔ کمزور دل کا کوئی آدمی تو حکومت کے خلاف کوئی آواز اُٹھانے کی ہمت بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن بھولا بھائی ڈیسائی آسانی سے زیر ہونے والے نہیں تھے۔ مخالف لیڈر کی حیثیت سے انھوں نے زبردست ہمت کا مظاہرہ کیا۔ آخر پہلے بھی تو وہ ایک بہترین وکیل رہ چکے تھے۔ سیاست میں آنے کے بعد بھی ان کا وکالت والا مزاج بدستور بنا رہا اور ان کے مخالف لیڈر ہونے میں بہت کام آیا۔

بھولا بھائی ڈیسائی مرکزی لیجسلیٹو اسمبلی کے کاموں میں بہت مصروف رہتے تھے۔ اس کے باوجود وہ کانگریس کے اندرونی معاملات میں بھی کافی دل چسپی لیتے تھے۔

کانگریس کے لیڈروں میں اس بات پر اختلاف پیدا ہو گیا تھا کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت جو دستور بنایا گیا تھا اس کے مطابق انھیں الیکشن لڑنا چاہیے یا نہیں۔ آخر کار ایک پالیسی طے ہوئی اور 1937 میں کانگریس نے صوبائی لیجسلیٹو اسمبلی کے الیکشن میں اپنے امیدوار کھڑے کر دیے۔ اس کے بعد یہ فیصلہ کرنا بھی ضروری ہو گیا کہ جہاں جہاں کانگریس کے امیدوار کافی تعداد میں جیت جائیں وہاں حکومت کیسے بنائی جائے۔ کافی گرما گرم بحث کے بعد

آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے عہدے قبول کرنے کا ریزولیشن پاس کر دیا۔ اس بات کے ساتھ یہ شرط بھی لگائی گئی کہ صوبوں میں وزیروں کی صلاح کو نظر انداز کرکے، صوبوں کے گورنر اپنی خصوصی طاقتوں کا استعمال نہ کریں۔ آخر کار وائسرائے نے زیادہ سے زیادہ تعاون دینے کا وعدہ کر دیا اور جن صوبوں میں کانگریس نے اکثریت حاصل کی تھی وہاں کانگریس نے حکومتیں بنالیں۔ دو صوبوں میں ملی جلی سرکار بنی۔ صرف پنجاب اور بنگال دو ایسے صوبے تھے جن میں کانگریس منسٹری نہیں بنی تھی۔

جنگ کے دوران

دوسری جنگ عظیم کے اعلان نے ہندوستان کی سیاست میں کئی نئے مسئلے پیدا کر دیے۔ 1938 میں ہری پورا میں کانگریس کا جو اجلاس ہوا اس میں جنگ کے خلاف ایک ریزولیشن پاس کیا گیا۔ کانگریس نے صاف لفظوں میں یہ کہا کہ جنگ "برطانوی سامراج کے فائدہ کے لیے" لڑی جا رہی ہے۔ اس لیے جنگ کے لیے جو تیاریاں ہندوستان میں کی جا رہی ہیں کانگریس ان کے خلاف ہے کیوں کہ جنگ کی ان تیاریوں میں ہندوستانیوں کے مرضی کے بغیر ہندوستانی وسائل کا استعمال کیا جا رہا ہے۔

جب ہندوستان کے لوگوں کو یہ احساس ہو گیا کہ قانون ساز اسمبلی کی منظوری لیے بغیر ہندوستان کو جنگ کی آگ میں دھکیل دیا گیا ہے تو 1939 میں کانگریس وزارتوں نے استعفیٰ دے دیے۔ تمام کانگریسی ممبروں کے ساتھ بھولا بھائی ڈیسائی نے بھی قانون ساز اسمبلی کی ممبری سے استعفیٰ دے دیا۔ انھیں کانگریس پارٹی کے لیے کام کرنے کے لیے زیادہ وقت ملنے لگا۔ اب جہاں بھی ضرورت پڑتی وہ قانونی صلاح دینے کو تیار ہو جاتے۔

بھولا بھائی ڈیسائی اس بات کو بہت اہمیت دیتے تھے کہ مرکزی اسمبلی کے ذریعہ ساری دنیا کو یہ بات بتا دی جائے کہ ہندوستانی کو خواہ مخواہ جنگ میں گھسیٹ لیا گیا ہے اور یہ کہ کانگریس اس بات کو بالکل پسند نہیں کرتی۔ 19ر نومبر 1940 کو بھولا بھائی ڈیسائی نے اسمبلی میں ایک تقریر کی جس میں انھوں نے کہا کہ وہ بجٹ کو تسلیم نہیں کرتے اور ایسا نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان پر اس کی مرضی کے خلاف جنگ تھوپی گئی تھی۔ انھوں نے کہا تھا "اگر جنگ ہندوستان کی جنگ نہیں ہے تو آپ لوگوں (انگریزوں) کو ہندوستان کی حمایت ملنا ناممکن

ہے۔'' اس تقریر میں انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ ''برطانیہ کے لوگ جو جمہوریت کی تعریف کرتے نہیں تھکتے یہ محض ان کا دکھاوا ہے۔''

گاندھی جی نے جنگ کے سلسلہ میں احتجاج کے طور پر ذاتی طور پر ستیہ گرہ شروع کیا تھا۔ بھولا بھائی ڈیسائی اس ستیہ گرہ میں شامل ہوگئے۔ اس بات کو لے کر 10/دسمبر 1940 کو ڈیفنس آف انڈیا رول کے تحت ان کو گرفتار کرلیا گیا اور یراودہ جیل میں نظر بند کردیا گیا۔ پہلے کی طرح اس بار بھی جیل کے افسران نے بھولا بھائی کا کافی خیال رکھا اور ان کو بہت سی رعایتیں دیں۔ اس زمانہ میں جیل کا قانون تھا کہ جو لوگ ستیہ گرہ کرتے تھے رات کے وقت ان کی جیل کی کوٹھری کو تالا لگادیا جاتا تھا۔ بھولا بھائی ڈیسائی نے اس قانون کو ختم کرنے کے لیے زوردار آواز اٹھائی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ قانون ختم کردیا گیا۔ انھوں نے جیل کے افسران سے یہ درخواست بھی کہ جو قیدی جیل کے اندر قانون توڑتے ہیں ان کو کوڑے نہ لگائے جائیں۔ جیل میں ان کی صحت بہت خراب ہوگئی تو ستمبر 1941 میں ان کو رہا کردیا گیا۔

امریکہ اور برطانیہ نے اگست 1941 کے 'اٹلانٹک چارٹر' میں اپنی جنگ کے مقاصد کا اعلان کیا تھا۔ دوسری باتوں کے علاوہ انھوں نے اس اعلان میں اس بات کا بھی ذکر کیا تھا کہ تمام قوموں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے ملک میں خود اپنی حکومتیں بنائیں اور ''جن لوگوں کو اپنی خودمختاری اور اپنی حکومت بنانے کے حق سے محروم کردیا گیا ہے'' ان کو یہ حق دیا جائے۔ اس اعلان سے ہندوستان میں ایک نئی امید کی کرن دکھائی دینے لگی تھی لیکن بدقسمتی سے برطانیہ کے وزیراعظم ونسٹن چرچل نے جلد ہی اس بات کی وضاحت کردی کہ یہ اعلان ہندوستان کے بارے میں نہیں ہے۔

دسمبر 1941 میں جب جاپان دوسری جنگ عظیم میں شامل ہوگیا تو صورت حال بہت سنجیدہ ہوگئی۔ وائسرائے نے یہ اپیل کی کہ جاپانی فوجوں کو پسپا کرنے میں ہندوستان، برطانیہ کا ساتھ دے۔ کانگریس نے یہ بات نہیں مانی لیکن یہ ضرور کہا کہ اگر جاپان حملہ کرتا ہے تو حکومت سے الگ رہ کر ہندوستان اپنے ملک کی حفاظت کا کام کرے گا۔ مسلم لیگ نے جاپان کے حملہ کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی بلکہ پاکستان کی مانگ کو اور تیز کردیا۔

فروری 1942 میں لبرل فیڈریشن نے حکومت برطانیہ پر دباؤ ڈالا کہ وہ لبرل پروگرام کا نرم رویہ اختیار کرے اور ہندوستان میں ایک ایسی قومی حکومت کے قیام کی بات مان لے، جو حکومت برطانیہ کے سامنے جواب دہ ہو۔ حکومت برطانیہ نے اس چھوٹی سی مانگ کو بھی نہیں مانا بلکہ وہ یہی گیت گاتے رہے کہ ہندوستان میں فرقہ وارانہ اختلافات کی موجودگی میں ایسا نہیں کیا جا سکتا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان میں فرقہ وارانہ اختلافات کو خود انگریزوں نے ہی ہوا دی تھی۔ اس بات کے صرف دو مہینے بعد جب جاپانیوں نے رنگون پر قبضہ کر لیا تو حکومت برطانیہ نے سنجیدگی سے معاملہ پر غور کرنا شروع کیا اور چرچل نے ہندوستان کے ساتھ دستوری معاملات طے کرنے کے لیے کرپس مشن کا تقرر کیا۔

اس وقت کانگریس کے صدر مولانا ابوالکلا آزاد تھے۔ وہ کرپس مشن کے ساتھ بات چیت کرنے کی ذمہ داری لینے کو تیار تھے۔ مگر ان کی شرط یہ تھی کہ پہلے حکومت برطانیہ ہندوستان میں صحیح معنوں میں قومی حکومت قائم کرنے کی بات تسلیم کرلے۔ کانگریس نے بھی صاف طور پر یہ بات کہہ دی کہ اگر ہندوستان میں وائسرائے کونسل قائم رہی تو کرپس مشن کی کسی بھی تجویز پر غور نہیں کرے گی۔ حکومت برطانیہ اس بات پر راضی نہیں ہوئی اور کرپس مشن ناکام ہو گیا۔ اس زمانہ میں بھولا بھلائی ڈیسائی کانگریس ورکنگ کمیٹی میں شامل نہیں تھے لیکن سر اسٹیفورڈ کرپس ان سے ضرور ملنا چاہتے تھے۔ ان دونوں کی ملاقات ہوئی تو ضرور لیکن اس کا کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا۔

ہندوستان چھوڑو تحریک

کرپس مشن کی ناکامی کے بعد برطانوی حکومت کے لیے گاندھی جی کا نقطہ نظر سخت ہو گیا۔ انھوں نے اس بات کا اعلان کر دیا کہ برطانیہ سے ہندوستان کے پوری طرح علیحدہ ہونے کا وقت آ گیا ہے اور یہ علیحدگی جنگ کے بعد نہیں بلکہ جنگ کے دوران ہی ہو جانی چاہیے۔ اس اعلان کے نتیجہ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے 8/اگست 1942 کو "ہندوستان چھوڑو" ریزولیشن پاس کر دیا۔

اس زمانہ میں مولانا ابوالکلام آزاد بھولا بھائی ڈیسائی کے گھر ڈیرا ڈالے ہوئے تھے۔ ہندوستان چھوڑو تحریک کے چلنے سے بھولا بھائی ڈیسائی کو ڈر تھا کہ عوام توڑ پھوڑ پر آمادہ ہو جائیں گے۔

ان کو کسی طرح یہ خبر بھی پہلے ہی مل گئی تھی کہ اگلی صبح کو گاندھی جی سمیت کانگریس لیڈروں کو گرفتار کیا جا سکتا ہے۔

اگست 1942 اور جون 1945 کے درمیانی دور کی خاص بات یہ تھی کہ اس زمانہ میں توڑ پھوڑ اور تشدد کے بہت سے ہنگامے ہوئے۔ گاندھی جی کو اس بات سے سخت ذہنی تکلیف پہنچی اور انھوں نے 9/ فروری 1943 کو اپنا اکیس دن کا برت شروع کردیا۔ ساری قوم بے چین ہو اٹھی۔ ایچ۔پی۔ مودی، ایم۔ ایس۔ اینے اور کئی دوسرے لبرل خیالات والے لیڈروں نے بھی وائسرائے کی ایگزیکٹیو کونسل سے استعفے دے دیے۔ حکومت نے گاندھی جی کو جیل سے رہا کرنے کی اپیل کو ان سنا کردیا۔ گاندھی جی کو پونا میں آغا خاں پیلیس میں نظر بند کردیا گیا تھا۔ جب امریکہ کے صدر تھیوڈور روز ویلٹ کا ذاتی قاصد ان سے ملنے وہاں پہنچا تو حکومت نے اس کو بھی گاندھی جی سے ملنے کی اجازت نہیں دی۔ لیکن 2/ مارچ 1943 کو بالآخر گاندھی جی کو رہا کردیا گیا۔

9 اور 10/ مارچ کو لبرل خیال رکھنے والے لوگوں نے ایک کانفرنس کی جس کی صدارت تیج بہادر سپرو نے کی۔ اس کانفرنس میں ایک بیان جاری کیا گیا جس پر بھولا بھائی ڈیسائی، سی۔ راج گوپال آچاریہ، تیج بہادر سپرو، ایم۔ آر۔ جیکر اور کچھ دوسرے لوگوں نے دستخط کیے تھے۔

ملک کی سیاسی حالت پہلے جیسی ہی الجھی رہی۔ حکومت اپنی بات پر اڑی رہی اور کانگریس اور مسلم لیگ اپنی اپنی مانگوں پر قائم رہیں۔ ہندوستان کو تقسیم کر کے پاکستان قائم کرنے کے لیے مسلم لیگ کا شور شرابہ بہت بڑھ گیا تھا، اس لیے گاندھی جی نے محمد علی جناح کے ساتھ اس معاملہ پر بات چیت کرنے کے لیے آمادگی ظاہر کردی۔

اس دوران جنگ کے حالات بڑے ڈرامائی انداز میں اتحادی ملکوں کے حق میں تبدیل ہو گئے۔ گاندھی جی نے اعلان کیا کہ جب تک جنگ جاری ہے تب تک کانگریس ایک ایسی قومی حکومت بنانے کو تیار ہے جس میں مرکزی لیجسلیٹو اسمبلی کے لیے نمائندوں کو انتخابات کے ذریعہ چنا جائے گا اور اس حکومت کو شہری انتظام چلانے کا پورا اختیار حاصل ہوگا۔ گاندھی جی کی اجازت سے، بھولا بھائی ڈیسائی حالات کو اس مقام تک لے آئے تھے لیکن ان

کوششوں کو کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ ایسا لگتا تھا کہ گاندھی جی نے بھولا بھائی ڈیسائی کو اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ وہ اس معاملہ کا کوئی حل نکالنے کے لیے وائس رائے سے بات چیت کریں۔ بھولا بھائی ڈیسائی وائسرائے سے ملے اور بات چیت کے دوران بتایا کہ ہندوستانی اس بات پر مطمئن ہیں کہ ہندوستان کو خود مختار حکومت کا درجہ ڈومینن اسٹیٹس دے دیا جائے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ وزارت میں ایک مسلمان ممبر کو شامل کرنے کے لیے کانگریس راضی ہو جائے گی۔ لیکن شرط یہ ہوگی کہ وہ مسلم وزیر سب وزیروں کے ساتھ مل کر اجتماعی ذمہ داری کے اصول کو مانے

ڈیسائی اور لیاقت علی کی ملاقات

لیاقت علی خاں مسلم لیگ کے ایک اہم لیڈر تھے۔ وہ اس بات کے لیے تیار تھے کہ اگر مجوزہ عارضی حکومت کی بناوٹ اور اس کے کاموں کی وضاحت کر دی جائے تو وہ کانگریس کے ساتھ سمجھوتہ کر سکتے ہیں۔ اس بات کو لے کر بھولا بھائی ڈیسائی اور لیاقت علی کی کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ مارچ 1945 میں بھولا بھائی ڈیسائی سیواگرام پہونچے اور انھوں نے گاندھی جی کو بتایا کہ لیاقت علی سے کی گئی بات چیت کا رخ کیا تھا۔ اس موقع پر گاندھی جی نے یہ خواہش ظاہر کی کہ پارلیمنٹ کے معاملہ میں کانگریس اور مسلم لیگ مل جل کر کام کریں۔

20 / جون 1945 کو بھولا بھائی ڈیسائی ایک بار پھر وائسرائے سے ملے، لیکن اس ملاقات میں کیا باتیں ہوئیں اس کی تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔ وائسرائے سے دوبارہ ملنے اور لیاقت علی سے بات چیت کرنے کے بعد ڈیسائی لیاقت گفتگو کے تحت سیاسی معاملات کو آگے بڑھانے کی کوشش کے بعد بھولا بھائی ڈیسائی اس کوشش میں لگے گئے کہ سیاسی حالات کی پیچیدگی کو کچھ ختم کیا جائے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے لندن میں سراسٹیفورڈ کرپس سے خط وکتابت بھی کی۔

مارچ 1945 میں بھولا بھائی ڈیسائی نے مرکزی لیجسلیٹو اسمبلی میں اپنی آخری تقریر کی۔ ایسا سوچا جا رہا تھا کہ کانگریس ممبران کے اسمبلی سے غیر حاضر رہنے کی وجہ سے حکومت جنگ کا بجٹ پاس نہیں کر پائے گی۔ اس لیے سروجنی نائیڈو نے بھولا بھائی ڈیسائی سے درخواست کی کہ وہ بجٹ سیشن میں شامل ہوں اور بجٹ کو ناکام بنانے کے لیے مخالفت کا کام صحیح طور پر چلائیں۔ اس موقع پر بھولا بھائی ڈیسائی نے بہترین قابلیت اور مستعدی کا مظاہرہ کیا۔ ان کی

زبردست تقریر نے جادو کا سا اثر کیا۔ اور بجٹ کی مخالفت کرنے کے لیے اسمبلی کے مسلم لیگی اور آزاد ممبر کانگریس کے ساتھ ہوگئے۔ آدھے سے کچھ زیادہ ووٹ بجٹ کی مخالفت میں آئے اور بجٹ پاس نہیں ہوسکا۔

ایسا لگنے لگا تھا کہ جنگ، ختم ہونے والی ہے۔ ایسے ماحول میں خود برطانیہ کے لوگوں میں، ہندوستان کی حمایت کا رجحان اور زیادہ بڑھ گیا۔ وائسرائے خود لندن گئے اور حکومت برطانیہ سے بات کی کہ ہندوستانی لیڈروں سے کن شرطوں پر سمجھوتہ کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں 14/جون 1945 کو ریڈیو پر کئی تجویزوں کا اعلان کیا گیا جس کے نتیجہ میں شملہ کانفرنس ہوئی۔ اس کانفرنس میں مختلف سیاسی پارٹیوں کے رہنما شامل ہوئے۔

ادھر جرمن فوجوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ اور اُدھر انگلینڈ میں لیبر پارٹی کی حکومت قائم ہوگئی۔ جلد ہی کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کو جیل سے رہا کر دیا گیا۔ ان سب نے ڈیسائی اور لیاقت علی کی بات چیت کو مان لیا اور بھولا بھائی ڈیسائی نے شملہ کانفرنس میں دل چسپی لینی شروع کردی۔ ان کا خیال تھا کہ اس کانفرنس سے ہندوستان کی فرقہ وارانہ الجھن کو حل کرنے میں مدد ملے گی۔

شملہ کانفرنس میں کانگریس نے مسلم لیگ کے دو قوموں کے نظریہ کی بات نہیں مانی اور کانفرنس ناکام ہوگئی۔ کانگریس اس بات پر بھی اڑی رہی کہ عارضی حکومت میں مولانا آزاد اور آصف علی جیسے نیشلسٹ مسلمانوں کو شامل کیا جائے۔

ستمبر 1945 میں کانگریس نے مجلسِ قانون 'کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی' بنانے کے لیے الکشن لڑنے کا فیصلہ کیا لیکن بھولا بھائی ڈیسائی کا نام الکشن کے امیدواروں کی فہرست میں نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کانگریسی حلقے کے لوگ یہ سوچتے تھے کہ جس زمانہ میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبران جیلوں میں تھے، بھولا بھائی ڈیسائی نے خود کافی شہرت حاصل کرلی تھی۔ حالاں کہ گاندھی جی نے خود کہا تھا کہ بھولا بھائی ڈیسائی کی نیت میں کسی طرح کا شبہ نہیں کیا جاسکتا لیکن کانگریسی حلقہ میں بھولا بھائی ڈیسائی کے بارے میں وہی تاثر بنا رہا۔ کچھ مخالفین نے تو ان کی ذاتی زندگی پر بھی نکتہ چینی کی۔

ڈیسائی لیاقت علی کی بات چیت اخباروں میں شائع ہوئی مگر تعجب کی بات یہ تھی کہ اس میں بھولا بھائی ڈیسائی کا ذکر نہیں کیا گیا تھی۔ بھولا بھائی ڈیسائی کے خیال سے یہ ایک مشترکہ بیان کی صورت میں شائع ہونا چاہیے تھا۔ لیکن ان کو اس وقت بہت حیرت ہوئی جب لیاقت علی نے پارلیمنٹ میں اس بات سے صاف انکار کر دیا کہ سیاسی حالات کی پیچیدگی، ختم کرنے کے لیے ان کے بیچ "مل کر کام کرنے" کے بارے کوئی سمجھوتہ ہوا تھا۔

اس قسم کے پروپیگنڈے سے بھولا بھائی ڈیسائی کو کافی دھکا لگا۔ مرکزی انتخابات کے لیے جب ان کو ٹکٹ نہیں دیا گیا تو ان کے دل کو گہری چوٹ پہنچی اور ان کی صحت اور زیادہ خراب ہو گئی۔

آئی۔ این۔ اے۔ کا مقدمہ

پھر بھی بھولا بھائی ڈیسائی کی عوامی زندگی اس حادثے پر ختم نہیں ہوئی۔ ان کی موت سے چند مہینے پہلے ان پر ایک ذمہ داری اور ڈالی گئی۔ حالاں کہ ان کو کانگریس سے کافی مایوسی ہوئی تھی لیکن انھوں نے بخوشی اس ذمہ داری کو قبول کر لیا۔

یوروپ میں جب دوسری جنگ عظیم زور و شور سے چل رہی تھی، سبھاش چندر بوس ہندوستان سے فرار ہو گئے تھے۔ ہندوستانی فوج کے ہزاروں سپاہی انگریزوں کے لیے لڑ رہے تھے۔ سبھاش چندر بوس نے انھیں راضی کر لیا تھا کہ وہ ان کی رہنمائی قبول کر لیں۔ اس طرح انھوں نے اپنی ایک فوج تیار کر لی تھی جو انڈین نیشنل آرمی (INA) کہلاتی تھی۔ انھوں نے آئی۔ این۔ اے کے سپاہیوں کو "دہلی چلو" کا نعرہ بھی دیا تھا۔

جب 1940 میں سنگاپور پر جاپانیوں کا قبضہ ہو گیا تو برطانوی حکومت نے چالیس ہزار جاپانی جنگی قیدی جاپان کی حکومت کے سپرد کر دیے۔ اس زمانہ میں سمندر پار رہنے والے ہندوستانیوں نے ہندوستان کو آزاد کرانے کے مقصد سے "انڈیا انڈی پنڈنس لیگ" پہلے ہی بنالی تھی۔ انڈین نیشنل آرمی کی پہلی کانفرنس جون 1942 میں بنکاک میں ہوئی تھی۔ اسی وقت انڈین نیشنل آرمی بنانے کا خیال اپنا لیا گیا تھا۔

سبھاش چندر بوس نے جاپان کی حکومت سے خفیہ طور پر بات چیت کی اور اس بات کا وعدہ

لے لیا کہ جاپان انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے معاملہ میں ہندوستانیوں کی مدد کرے گا۔ یہ وعدہ لینے کے بعد اگست 1943 میں وہ سنگاپور پہونچ گئے۔ وہ انڈیا انڈی پنڈنس لیگ کے صدر بھی بنے۔ اس کے بعد اکتوبر 1943 میں انھوں نے ایک عبوری حکومت 'پروویزنل گورنمنٹ' بنانے کا اعلان کیا اور اس حکومت نے امریکہ اور برطانیہ کے خلاف اعلان جنگ کیا۔

لیکن جلد ہی جاپان کے فوجی افسروں اور سبھاش چندر بوس کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے۔ جاپانی فوجی افسران چاہتے تھے کہ ہندوستان کو آزادی دلانے کا کام مکمل طور پر ان پر ہی چھوڑ دیا جائے جب کہ سبھاش چندر بوس چاہتے تھے کہ ہندوستانی سرحدوں پر حملہ کرنے کے لیے فوج کی قیادت آئی۔این۔اے کرے۔ آخر کار یہ طے پایا کہ آزمائش کے طور پر پہلے آئی۔این۔اے۔ ایک کی ایک رجمنٹ بھیجی جائے اور اگر اس نے صحیح طور پر کامیابی حاصل کی تو جاپانی ملٹری کے تحت رہنے والی ساری کی ساری انڈین نیشنل آرمی میدانِ جنگ میں اتار دی جائے گی۔ نتیجہ کے طور پر آئی۔این۔اے کی کچھ ٹکڑیاں مئی 1944 میں منی پور میں مائرانگ کے مقام پر پہنچیں اور وہاں پر انھوں نے ہندوستان کا ترنگا جھنڈا لہرا دیا۔ انگریزوں کے خلاف جنگ کرتے ہوئے آئی۔این۔اے کو بہت سخت حالات کا سامنا کرنا پڑا مگر وہ بہادری کے ساتھ لڑتی رہی اور پیچھے نہیں ہٹی۔

اسی دوران جاپان نے مشرق بعید اور جنوب مشرقی ایشیا میں سمندر اور زمین پر اپنے حملے جاری رکھے۔ جاپانی فوجیں ہندوستان کی سرحدوں سے پیچھے ہٹ گئیں اور اس طرح انڈین نیشنل آرمی کو بھی پیچھے ہٹنا پڑا۔ 6/ اگست 1945 کو امریکہ نے ہیروشیما پر اور پھر 9/ اگست کو ناگاساکی پر ایٹم بم گرادیے اور جاپان کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔

اس واقعہ کے ایک ہفتہ بعد 17/ اگست 1945 کو جب سبھاش چندر بوس تائے پی کے ہوائی اڈے سے اپنا ہوائی سفر شروع کر رہے تھے تو ان کا جہاز حادثے کا شکار ہو گیا اور وہ اسی میں ختم ہو گئے۔ آئی۔این۔اے کے تین افسران گرفتار ہو گئے اور ہندوستان کی حکومت نے بغاوت کے الزام میں ان کے کورٹ مارشل یعنی فوجی عدالت میں ان پر مقدمہ چلانے کا اعلان کیا۔ یہ تین افسران شاہ نواز خان، پی۔ کے۔ سہگل اور جی۔ ایس۔ ڈھلوں تھے۔

حالات کے اس موڑ پر انڈین نیشنل کانگریس نے ایک ڈیفنس کمیٹی مقرر کی جس میں پنڈت جواہر لال نہرو، تیج بہادر سپرو، بھولا بھائی ڈیسائی، سردار ولبھ بھائی پٹیل اور کچھ دوسرے لوگ شامل تھے۔ اکتوبر 1945 میں آئی۔ این۔ اے کے تین افراد کا کورٹ مارشل ہوا اور اس کی کارروائی ''لال قلعہ کا مقدمہ'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس مقصد کے لیے لال قلعہ کو خاص طور پر اس لیے چنا گیا تھا کہ اُس ہندوستانی فوج کو جو انگریزوں کی وفادار تھی، اس جرم کی شدت کا احساس ہو سکے۔ 17 ہندوستانی وکیلوں نے اس مقدمہ کی پیروی کی۔ ان میں جواہر لال نہرو بھی شامل تھے۔ اور پورے 30 سال بعد انھوں نے عدالت میں جرح کرنے کے لیے بیرسٹر کا گاؤن پہنا تھا۔

دفاع کے لیے بھولا بھائی ڈیسائی سب سے بڑے وکیل تھے۔ ان کی صحت ان دنوں زیادہ ہی خراب تھی اس لیے عدالت میں بھی ان کے ساتھ ڈاکٹر رہا کرتے تھے۔

اپنی صحت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بھولا بھائی ڈیسائی نے اپنے وکالت کے پیشہ کی بہترین صلاحیتیں اس مقدمہ میں لگادیں۔ انھوں نے آئی۔ این۔ اے کے افسروں کے دفاع میں بڑی موثر دلیلیں دیں اور پر زور طریقے سے اپنے قومی جذبہ کا اظہار کیا۔ وکالت کی اپنی پوری زندگی میں اس مقدمہ کے دوران ''وہ قانونی پیشہ کے سب سے اونچے مقام'' تک پہنچ گئے۔ واقعی یہ ان کے لیے بڑا شاندار دور تھا۔

بھولا بھائی ڈیسائی لگاتار تین مہینے تک اس مقدمہ میں مصروف رہے۔ کئی دن تک ان کی دفاعی تقریر عدالت میں چلی اور کمال کی بات یہ تھی کہ اس کے لیے انھوں نے پہلے سے کوئی نوٹس بھی نہیں بنائے تھے۔ انھوں نے اپنی جرح میں زیادہ تر بین الاقوامی قانون کو بنیاد بنایا۔ اس معاملہ میں ان کے ساتھ ایک اور بھی دقت تھی اور وہ یہ کہ ان کو سیدھی سادی مگر زوردار زبان میں بحث کرنی پڑتی تھی تاکہ فوجی عدالت کے جج اس کو آسانی سے سمجھ سکیں۔

حکومت نے تینوں افسران پر بغاوت کا الزام ثابت کرنے کے لیے ثبوت پیش کیے اور اس بات پر زور دیا کہ ان تینوں نے دراصل تاج برطانیہ کے خلاف اعلان جنگ کیا تھا۔ بھولا بھائی ڈیسائی نے ان ہی ثبوتوں کو تینوں افسروں کے دفاع کے لیے استعمال کیا۔ انھوں نے دلیل

دی کہ بین الاقوامی قانون کے تسلیم شدہ اصولوں کے مطابق ان کو اس بات کا حق حاصل تھا کہ وہ اپنے ملک کی آزادی کے لیے ہتھیار اٹھائیں۔ انھوں نے ایک ایسی حکومت کے حکم کی تعمیل کی تھی جو سبھاش چندر بوس نے بنائی تھی اور جسے کئی آزاد ملکوں نے تسلیم کیا تھا، اس لیے ان تینوں پر ہندوستان کے فوجداری قانون کی خلاف ورزی کرنے کا جرم عائد نہیں ہوتا۔ دفاع کرتے ہوئے اپنی تمام بحث میں اور گواہوں سے سوالات پوچھنے کے دوران بھولا بھائی ڈیسائی نے قانون کے پیشہ کی "بہترین روایات" کو مد نظر رکھا۔ ان کی صحت اور زیادہ خراب ہو گئی اور ڈاکٹروں نے ان کو آرام کا مشورہ دیا لیکن انھوں نے کہا "موت آتی ہے تو آنے دو" میں وطن سے سچی محبت کرنے والوں کو بے سہارا تو نہیں چھوڑوں گا۔

انگریزوں کے لیے یہ ان کی وقعت اور عزت کا سوال تھا۔ عدالت نے آئی۔ این۔ اے کے تینوں افسران کو مجرم قرار دیا اور زندگی بھر کے لیے ملک بدر کر دینے کا فیصلہ سنا دیا۔ اس مقدمہ سے ہندوستانیوں میں وطن سے محبت اور قومی وقار کے جذبات اور بھی زیادہ بیدار ہو گئے تھے۔ عدالت کے اس فیصلہ سے عوام میں ہلچل مچ گئی۔ دوسری طرف رائل نیوی اور ایئر فورس نے بغاوت کر دی۔ ان حالات سے مجبور ہو کر حکومت برطانیہ کو ان تینوں افسران کو بری کرنا پڑا۔

بھولا بھائی ڈیسائی کے اس تاریخی دفاع سے ہندوستانیوں کے دل بھر آئے اور بمبئی میں بھولا بھائی ڈیسائی کا ایک ہیرو کی طرح استقبال کیا گیا لیکن آئی۔ این۔ اے کے مقدمہ نے ان کی صحت کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ان کی صحت پھر کبھی ٹھیک نہیں ہو سکی اور 6/ مئی 1946 کو وہ اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ ان کی موت ایسے وقت ہوئی جب ہندوستان کو آزادی ملنے میں بس تھوڑے ہی دن باقی رہ گئے تھے۔

بھولا بھائی ڈیسائی نے جو زبردست دولت چھوڑی اس سے بھولا بھائی میموریل انسٹی ٹیوٹ قائم کیا گیا۔ بھولا بھائی ڈیسائی ہندوستان میں قانونی پیشے کی کچھ زبردست منجھی ہوئی شخصیتوں میں سے تھے، ساتھ ہی ساتھ وہ سیاسی رہنما بھی تھے اور ان سے سب سے زیادہ زبردست پارلیمنٹیرین تھے جن کا نہ کوئی ثانی تھا نہ استاد۔

بِدھان چندر رائے

امر تابوگرا

ہم کسی پہاڑ کی عظمت و شوکت کا اندازہ اس کی سب سے اونچی چوٹیوں کو دیکھ کر لگاتے ہیں۔ اگر اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ڈاکٹر بی۔ سی۔ رائے بلا شک و شبہ ایک عظیم ہستی تھے۔ وہ ہندوستان کے نئے دور میں بنگال بلکہ پورے ہندوستان کے عظیم ترین رہنماؤں میں سے ایک تھے۔

سُنیتی کمار چٹر جی

بدھان چندر رائے

کلکتہ میڈیکل کالج میں بدھان چندر کا یہ دوسرا سال تھا۔ چیر پھاڑ کی کلاس چل رہی تھی۔ ایک طالب علم نے کلاس سے باہر جھانک کر دیکھا اور کہاں ''ڈیمانسٹریٹر اور پرنسپل جنرل بم فورڈ صاحب، معانہ کرنے کے لیے اسی طرف آرہے ہیں''۔ ساری کلاس میں سنسنی پھیل گئی۔ جنرل بم فورڈ ایک زبردست عالم اور اعلیٰ کردار کے مالک مانے جاتے تھے۔ جیسے ہی وہ کلاس کے اندر داخل ہوئے کچھ پرجوش طالب علموں نے انھیں گھیر لیا اور ان میں سے ایک طالب علم نے بڑے اشتیاق کے ساتھ کہا'' معاف کیجیے گا جناب، کیا آپ کے زمانہ میں بھی یہ چیر پھاڑ کا کام اتنا ہی تھکا دینے والا ہوتا تھا جتنا ہمیں لگتا ہے؟''

ایک دوسرا طالب علم بولا'' چیر پھاڑ کی کلاس میں تو مجھے بڑا مزا آتا ہے۔ ذرا سوچو تو سچ، بات تو یہ ہے''

اس طالب علم کے باقی الفاظ دوسرے طالب علموں کی ملی جلی، آوازوں میں دب کر رہ گئے۔ جنرل بم فورڈ کی نظر اس طالب علم پر اٹک گئی جو اس شور شرابہ کے باوجود بڑی خاموشی اور توجہ سے اپنے کام میں مصروف تھا۔ وہ طالب علم کبھی کبھار اپنے سامنے میز پر رکھی ہوئی اس کتاب کو بھی دیکھ لیتا تھا جس میں چیر پھاڑ کے بارے میں ہدایات لکھی ہوئی تھیں۔ جرنل بم فورڈ اس طالب علم کے سامنے جاکر رک گئے۔

''کیا تم اچھے طالب علم ہو؟'' انھوں نے سوال کیا۔

اس نے جواب نہیں دیا مگر دل ہی دل وہ سوچ رہا تھا، کیسا عجیب سوال ہے۔ مجھے اس کا کیا

جواب دینا چاہیے؟'

ڈیمانسٹریٹر نے پرنسپل صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "معاف کیجیے سر، ان کے بارے میں میں آپ کو بتاؤں گا"۔ وہ دونوں تھوڑی دیر وہیں کھڑے رہے، بڑی سنجیدگی سے کچھ بات کرتے رہے اور جنرل بم فوراً اس طالب علم کی میز کے پاس آئے اور بولے "بابو! ہمیں تم سے بہت سی امیدیں ہیں" اور اس کے بعد وہ کلاس سے باہر چلے گئے۔

پرنسپل کی امیدوں کو واقعی دھکا نہیں لگا۔ جس طالب علم کو انھوں نے "بابو" کہا تھا وہ بدھان چندر رائے ہی تھے جو آگے چل کر ایک ممتاز ڈاکٹر، ماہر تعلیم، ملک کی آزادی کے سپاہی، انڈین نیشنل کانگریس کے ایک اہم لیڈر اور ہندوستان آزاد ہونے کے بعد بنگال کے وزیر اعلیٰ (چیف منسٹر) بنے۔

ابتدائی اثرات

بدھان چندر بہار میں ضلع پٹنہ کے بانکی پور قصبہ میں 1/جولائی 1882 کو پیدا ہوئے تھے۔ وہ اپنے ماں باپ کی پانچ اولادوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ ان کے والد کا نام پرکاش چندر تھا اور وہ ایکسائز انسپکٹر تھے۔ انھوں نے بدھان چندر کو خدا کے نام وقف کر دیا تھا۔ بدھان چندر سادھو تو نہیں بنے لیکن انھوں نے زندگی بھر شادی نہیں کی اور ساری عمر لوگوں کی خدمت کرتے رہے۔ بچپن سے ہی وہ بہت حساس تھے اور ان کا ذہن بہت جلد دوسروں کا اثر قبول کر لیتا تھا۔ اپنے ماں باپ کی سادگی، باقاعدگی اور پاکیزگی کا ان پر بہت گہرا اثر پڑا۔ اپنے بچپن کی یادوں میں سے ایک بات خاص طور پر ان کو ہمیشہ یاد رہی وہ یہ کہ ان کے گھر کی ایک دیوار پر ایک تختی لٹکی رہتی تھی جس پر لکھا تھا "کبھی مت کہو کہ میں یہ کام نہیں کر سکتا۔" اس جملہ سے ان کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی کہ حالات چاہے جتنے بھی خراب ہوں انھیں زندگی میں کبھی ہار نہیں ماننی چاہیے۔

بچپن سے ہی بدھان چندر کے دماغ میں یہ بات بھی ڈالی گئی تھی کہ اپنے گھر میں ان کی حیثیت دوسروں سے بڑھ کر نہیں ہے۔ ان کے والدین اپنے رشتہ داروں کے علاوہ دوسروں کا بھی

خیال رکھتے تھے اور ان سے بھی رشتہ داروں کی طرح محبت اور مہربانی کا سلوک کرتے تھے۔ اس بات سے بدھان چندر نے زندگی بھر کے لیے یہ سبق سیکھ لیا تھا کہ کوئی خاندان صرف رشتہ داروں سے مل کر ہی نہیں بنتا۔ اس طرح بدھان چندر کے دل میں دوسروں کی خدمت کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ یہی جذبہ تھا جو آگے چل کر ان کی زندگی میں خوب پھولا پھلا اور مختلف میدانوں میں انھوں نے زندگی بھر بہت کام کیا۔

جب بدھان چندر چودہ سال کے تھے تو ان کی ماں کا سایہ ان کے سر سے اٹھ گیا۔ ان کے والد پرکاش چندر رائے نے اپنی بیوی کی موت سے ہمت نہیں ہاری اور انھوں نے اپنے بچوں کو ماں کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ واقعی یہ کام بہت مشکل تھا لیکن انھوں نے کر دکھایا۔

وہ اپنے بچوں سے کہا کرتے تھے "میں تمہاری رہنمائی صرف اس وقت تک کروں گا جب تک تم 18 سال کے نہیں ہو جاتے"۔ انھوں نے اپنے بچوں کو کسی کام کے لیے کبھی مجبور نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ انھیں یہ سمجھایا کرتے تھے کہ اپنا فرض پورا کرنے اور اپنے سب طرح کے کام اپنے آپ کرنے سے انسان کا دماغ ترقی کرتا ہے۔

چناں چہ بدھان چندر اور ان کے بھائی بہن، گھر کا سارا کام اپنے ہاتھوں سے ہی کرتے تھے۔ اس طرح کی تربیت سے انھیں آگے چل اپنی پڑھائی کی زندگی میں بھی بہت مدد ملی اور اپنے پیشے اور سیاسی زندگی میں بھی بہت فائدہ ہوا۔

بچپن میں ایسا نہیں لگتا تھا کہ بدھان چندر غیر معمولی طور پر ذہین ہیں۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ وہ اپنا کام باقاعدگی کے ساتھ کر لیتے تھے اور ان کے پڑھائی کے سلسلے میں کسی کے کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ لیکن کچھ بڑے ہو کر کھیل کود میں زیادہ دلچسپی لینے لگے اور اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں ڈھیلے پڑ گئے۔ ایک بار امتحان دیتے ہوئے وہ اپنا پرچہ ادھورا چھوڑ کر چلے آئے۔ وجہ صرف یہ تھی کہ امتحان ہال کے پاس کھیل کے میدان سے فٹ بال کھیلنے کی آواز ان کے کان میں پڑ گئی تھی۔ اس وقت تک ان کو یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ امتحان پاس کرنا بہت اہم کام ہے لیکن آگے چل کر وہ سنجیدہ ہو گئے۔

پٹنہ کالج سے انھوں نے ریاضی (میتھس) میں آنرس کے ساتھ بی۔ اے پاس کیا۔ تھوڑے

دن بعد ہی بہار کے لفٹنٹ گورنر نے ان کو ڈپٹی مجسٹریٹ کے عہدے کی پیش کش کی لیکن ان کے والد نہیں چاہتے تھے کہ ان کے بیٹے سرکاری ملازمت کریں۔ بدھان چندر رائے (بی۔سی۔ رائے) نے سِب پور انجینیرنگ کالج اور کلکتہ میڈیکل کالج میں داخلہ کے لیے درخواستیں بھیجیں اور دونوں ہی کالجوں میں انھیں داخلہ مل گیا۔ کلکتہ میڈیکل کالج میں داخلہ کی منظوری کا خط انھیں انجینیرنگ کالج میں داخلہ کی منظوری کے خط سے دو چار گھنٹے پہلے ملا۔ بی۔سی۔رائے نے میڈیکل کالج میں داخلہ لینے کی بات طے کی اور جون 1901 میں وہ کلکتہ کے لیے روانہ ہو گئے۔

جس زمانے میں وہ کلکتہ میڈیکل کالج میں پڑھ رہے تھے ان کی نظر سے یہ کہاوت گزری ''جو کام تمہارے ہاتھ میں ہو اسے اپنی پوری طاقت لگا کر کرو۔'' زندگی بھر کے لیے بی۔سی۔رائے نے اس نقطہ نظر کو اپنا لیا اور آئندہ زندگی میں یہی الفاظ ان کی ہمت بڑھاتے رہے۔

کالج کے پہلے سال میں کچھ مشکلات تو آئیں لیکن یہ سال آرام سے گزر گیا۔ گھر سے جو پیسے انھیں ملتے تھے ان میں ان کو بڑی کفایت شعاری کے ساتھ گزارا کرنا پڑتا تھا۔ دوسرے سال کے دوران پرکاش چندر ڈپٹی کلکٹر کے عہدے سے ریٹائر ہو گئے اور ان کی آمدنی بس پنشن تک محدود ہو کر رہ گئی۔ اب وہ اس پوزیشن میں نہیں رہے کہ بدھان چندر کے خرچ کے لیے کچھ رقم بھیج سکیں۔ وہ تو اچھا ہوا کہ بدھان چندر کو کالج سے وظیفہ ملنے لگا۔ پھر بھی یہ رقم ان کے لیے کافی نہیں ہوتی تھی۔

اپنی غریبی اور مشکلات کے وہ دن بدھان چندر کبھی نہیں بھولے۔ کالج میں وہ پورے پانچ سال رہے لیکن ان پانچ برس میں وہ صرف ایک کتاب خرید سکے وہ بھی صرف پانچ روپیہ قیمت کی۔ وہ اپنے نصاب کی کتابوں سے نقل کر کے اپنے لیے نوٹس تیار کرتے تھے یا پھر کالج کی لائبریری سے کتابیں لے کر پڑھتے تھے۔ کبھی کبھی اپنے دوستوں سے بھی ان کو پڑھنے کے لیے کتابیں مانگنی پڑتی تھیں۔ ان کو یہ سب کچھ یاد رہا اور اسی لیے جب وہ خود پورے ڈاکٹر بن گئے تو غریب طالب علموں کو کتابیں خریدنے کے لیے پیسے دیتے رہے۔ بی۔سی۔رائے تفریح کے بھی کافی شوقین تھے لیکن اپنی زندگی کو بامقصد اور کامیاب بنانے کا خیال وہ کبھی

نہیں بھولے۔ وہ ہر روز دل لگا کر کام کرتے اور اگر کام ٹھیک ٹھاک ہو جاتا تو ان کو بڑا اطمینان محسوس ہوتا تھا۔

بی۔ سی۔ رائے کلکتہ میڈیکل کالج کے پرنسپل کرنل لیوکس اور کئی پروفیسروں سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ کرنل لیوکس نے خود نمونہ بن کر، بدھان چندر کے دل میں لوگوں کی خدمت اور اپنی قربانی دینے کا جذبہ بھر دیا تھا۔ پیشہ وارانہ زندگی میں ان کا اصول تھا کہ "انسان کا دل ایسا ہو جو کبھی سخت نہ ہو، مزاج ایسا ہو جو کبھی ست نہ پڑے اور اس کا سلوک ایسا ہو جس سے کسی کے دل کو چوٹ نہ پہنچے۔"

1904 میں بنگال کی تقسیم کا اعلان کیا گیا۔ بدھان چندر اس وقت میڈیکل کالج میں پڑھ رہے تھے۔ اروندو گھوش، بال گنگادھر تلک، لاجپت رائے اور بپن چندر پال قومی تحریک چلا رہے تھے۔ بنگال میں بھی اب یہ تحریک چل پڑی تھی۔ اس تحریک میں شامل ہونے کے لیے بی۔ سی۔ رائے کا دل بے چین تھا لیکن انھوں نے اپنے جذبات پر قابو پالیا۔ انھیں اس بات کا احساس تھا کہ وقت سے پہلے سیاست میں کود پڑنے کی بجائے وہ اپنی ڈاکٹری کی تعلیم پوری کر کے اپنے قومی مقصد کو پورا کرنے میں زیادہ مدد کر سکتے ہیں۔

پھر بھی قومی تحریک کا ان پر یہ اثر پڑا کہ انھوں نے اپنی طبیعت کے اُس جھکاؤ کو کم کر دیا جو انھیں مغربی کلچر اور طور طریقوں سے قریب کر رہا تھا۔ ان کی طرح اور بہت سے طالب علم مغربی کلچر اور یوروپ کے طرز زندگی کے حسین فریب میں پھنسے ہوئے تھے۔ بدھان چندر کا بھی یہی خیال تھا کہ پوری طرح نہ سہی، کافی حد تک انگریزوں کی طرح زندگی گزارنا زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ ایک زمانہ میں تو انھوں نے اپنا نام بھی 'بنجامن چارلس رائے' رکھ لیا تھا لیکن کرنل لیوکس نے ان کو اور دوسرے طالب علموں کو یہ محسوس کرنے میں مدد کی کہ انگریزی تہذیب سے صرف اچھی باتیں ہی اپنائی جانی چاہیں۔

ایم۔ بی۔ کے امتحان میں صرف پندرہ دن باقی تھے۔ بدھان چندر کالج کے گیٹ کے پاس کھڑے تھے کہ مڈوائفری کے پروفیسر کرنل پیک کی بگھی ادھر سے گزری۔ کالج اسٹریٹ میں ٹرام وے کچھ دن پہلے ہی چلنی شروع ہوئی تھی۔ حالاں کہ ٹرام چل رہی تھی مگر کوچوان

نے آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ شاید وہ سوچتا تھا کہ گورے صاحب کی گاڑی کو سڑک پر زیادہ حق حاصل ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ٹرام اور بگھی کی ٹکر ہو گئی۔ کرنل پیک نے سوچا کہ غلطی ٹرام کے ڈرائیور کی تھی اور وہ آس پاس کسی ایسے آدمی کو ڈھونڈنے لگے جو حادثہ کی گواہی دے سکے۔ اچانک ان کی نظر گیٹ پر کھڑے بدھان چندر پر پڑی اور وہ ان سے بولے "تم تو میڈیکل کے طالب علم ہو نا؟ تم نے یہ حادثہ ضرور دیکھا ہو گا۔ کیا تم گواہی دینے کے لیے تیار ہو؟"

"ضرور، میں گواہی دوں گا" بدھان چندر نے جواب دیا۔

"کیا ٹرام کار تیس مل فی گھنٹہ کی رفتار سے نہیں چل رہی تھی؟" کرنل پیک نے سوال کیا۔

"نہیں ایسا نہیں تھا۔ میرے خیال سے تو غلطی آپ کے کوچوان کی تھی" بدھان چندر نے جواب دیا۔

غصہ سے جھنجھلائے ہوئے پروفیسر صاحب آگے بڑھ گئے۔ ایک ہفتہ بعد انھوں نے بدھان چندر سے پھر اپنا گواہ بننے کے لیے کہا۔

"ٹھیک ہے لیکن اپنے بیان میں سے وہی بات کہوں گا، جو سچ تھی" بدھان چندر نے کہا۔

پروفیسر غصہ سے لال پیلے ہو گئے اور انھوں نے بدھان چندر کو اپنے گواہ کے طور پر پیش نہیں کیا۔

بی۔ سی۔ رائے نے تحریری امتحان میں تو امتیاز حاصل کیا لیکن جب وہ زبانی امتحان کے لیے کرنل پیک کے سامنے حاضر ہوئے تو کرنل پیک نے انھیں کمرے سے باہر نکال دیا۔ زندگی میں پہلی بار بی۔ سی۔ رائے نے ناکامی کی کڑواہٹ محسوس کی۔ ان کا دل بیٹھ گیا۔ کرنل لیوکس نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ ایل۔ ایم۔ ایس کے امتحان میں بیٹھیں۔ اس امتحان میں صرف پندرہ دن باقی تھے۔ مگر پھر پروفیسر لیوکس نے بڑی خاموشی سے کرنل پیک سے گفتگو کی۔ بی۔ سی۔ رائے چاہتے تو نہیں تھے لیکن ایک بار پھر وہ کرنل پیک کے سامنے حاضر ہوئے۔ کرنل پیک ان کو دیکھ کر چیختے ہوئے بولے "تمھیں کس نے فیل کیا؟"

"آپ ہی نے فیل کیا تھا سر" بی۔ سی۔ رائے نے جواب دیا

"تو تم دوبارہ جانچ کرانے کے لیے میرے پاس کیوں نہیں آئے؟ میں تمھیں پاس کر دیتا" کرنل پیک نے کہا۔

"آپ ایک امتحان لینے والے تھے۔ میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ آپ سے اس سلسلہ میں ملوں" بی۔ سی۔ رائے نے جواب دیا۔

" چلو ٹھیک ہے۔! مجھے تمہارا امتحان لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ جاؤ تم پاس ہو" کرنل پیک نے کہا۔

ڈاکٹری میں گریجویشن کی ڈگری لینے کے فوراً بعد بی۔ سی۔ رائے پراونشیل ہیلتھ سروسز کے تحت ڈاکٹری کرنے گئے۔ اس نوجوان ڈاکٹر کی سب سے خاص بات یہ تھی کہ وہ سخت محنت سے جی نہیں چراتا تھا۔ اسپتال میں وہ ہر قسم کا کام کر لیتے تھے۔ مریضوں کو نسخے لکھنے کے علاوہ وہ ان کی تیمار داری بھی کرتے تھے اور اگر ضرورت پڑتی تھی تو ان کے لیے کھانا بھی پکا دیتے تھے۔ جب کبھی ان کو فرصت ملتی وہ پرائیویٹ طور پر بھی مریضوں کو دیکھ لیا کرتے تھے لیکن فیس صرف دو روپیہ ہی لیتے تھے۔ وہ اسی طرح محنت کرتے رہے اور ایم۔ ڈی بھی ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلینڈ جانے کا پکا ارادہ کر لیا۔ انھوں نے اس مقصد کے لیے، دو سال تین مہینے کی چھٹی لی اور اپنی معمولی سی کمائی میں سے بارہ سو روپیہ بچا کر دہ فروری 1909 میں انگلینڈ کے لیے روانہ ہو گئے۔

سینٹ بارتھولومیو میں

ڈاکٹر رائے نے جب سینٹ بارتھولومیو میں داخلہ کے لیے درخواست دی تو ان کو ایک ذہنی جھٹکے کا سامنا کرنا پڑا۔ ڈین، ایشیا سے آئے ہوئے کسی طالب علم کو داخلہ نہیں دینا چاہتا تھا۔ چناں چہ اس نے انھیں داخلہ دینے سے انکار کر دیا لیکن ڈاکٹر رائے نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ بار بار ڈین سے ملے اور ان کی مستقل مزاجی سے ان کو فائدہ بھی ہوا۔ جب ڈاکٹر رائے تیرھویں بار ڈین سے ملے تو ڈین نے اپنی ضد چھوڑ دی اور داخلہ دے دیا۔

روپیہ پیسہ کی کمی کی پریشانی سے بھی ڈاکٹر رائے بددل نہیں ہوئے۔ان کے پاس پچاس روپیہ فی ہفتہ سے زیادہ بجٹ نہیں ہوتا تھااور انگلینڈ میں رہنے کے لیے یہ رقم واقعی بہت کم تھی۔ اپنی تعلیم کا خرچ پورا کرنے کے لیے وہ مریضوں کی دیکھ بھال کا کام کر کے کچھ کما لیتے تھے۔ پھر بھی دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے ان کے پاس پیسے نہیں ہوتے تھے۔اسپتال چھ میل دور تھا جس دن وہ بس میں بیٹھ کر اسپتال چلے جاتے تھے اس دن شام کی چائے پیے بغیر ہی ان کو گزارا کرنا پڑتا تھا۔ڈاکٹری کی کتابیں وہ خرید نہیں سکتے تھے۔اس لیے دوستوں سے مانگ مانگ کر کتابیں پڑھا کرتے تھے۔جب ان کو اپنا خرچ پورا کرنے میں اور بھی زیادہ دقت ہونے لگی تو انھوں نے ایک اور کام کرنا شروع کر دیا۔جو ڈاکٹر چھٹی پر ہوتے تھے۔ان کی جگہ پر کام کر لیا کرتے تھے۔دوسری طرف وہ اپنی ڈاکٹری کی پڑھائی کم سے کم عرصہ میں پوری کرنا چاہتے تھے۔ اور ایسا ہوا بھی۔ دو سال تین مہینے میں ہی انھوں نے ایم۔ آر۔ سی۔پی اور ایف۔ آر۔ سی۔ ایس کی دو ڈگریاں حاصل کر لیں اور یہ ثابت کر دیا کہ ''اگر انسان اپنا کام جی جان کی بازی لگا کر کرے تو وہ اپنا مقصد حاصل کر ہی لیتا ہے۔''

ایک وقت تھا کہ ڈین نے ڈاکٹر رائے کو داخلہ دینے سے انکار کر دیا تھااور ان کے امتحان پاس کرنے پر اسی ڈین نے ان کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا ''اگر تم کسی طالب علم کی سفارش کر کے بھیجو گے تو میں سینٹ بارتھولومیو میں اُس کو بخوشی داخلہ دے دوں گا۔'' اور ایسا ہوا بھی۔ڈاکٹر رائے نے کئی طالب علموں کی سفارش کی اور انھوں نے لندن کے اس شاندار طبی ادارے سے اپنی تعلیم مکمل کی۔

1911 میں انگلینڈ سے واپس آکر ڈاکٹر رائے نے کلکتہ میڈیکل کالج میں پڑھانا شروع کر دیا۔ اس کے بعد انھوں نے، کیمپ بیل میڈیکل اسکول اور پھر کارمیکائل میڈیکل کالج میں بھی پڑھایا۔

مالی مشکلات پہلے کی طرح اب بھی ان کو گھیرے رہتی تھی، لیکن وہ کامیابی حاصل کرنے کے لیے صبر اور محنت کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے تیار تھے۔دوستوں سے قرض لے کر انھوں نے اپنا ایک چھوٹا سا کلنک بنا لیا اور الگ پریکٹس شروع کر دی۔ چند ہی مہینوں میں انھوں نے قرض لی ہوئی رقم واپس کر دی اور پھر بہت جلدی ان کی پریکٹس خوب چل نکلی۔

ان کے مریضوں کے علاوہ ان کے طالب علموں اور ساتھیوں تک ان کی شہرت پھیل گئی۔ انھوں نے اپنی پچاس برس کی پریکٹس میں نہ کسی سے فیس لی اور نہ کسی کو تقاضہ کے طور پر بل بھیجا۔

جب انھوں نے ڈاکٹری کی پریکٹس شروع کی تب انھیں یہ احساس ہوا کہ لوگوں کی زندگی میں کتنی تکلیفیں اور کتنی غریبی ہے۔ عام لوگوں کی پریشانیاں دیکھ کر ان کا دل ہل جاتا تھا۔ اب ان کی زندگی کا خاص مقصد یہی بن گیا تھا کہ وہ سچے دل کے ساتھ، جہاں تک ہو سکے لوگوں کے لیے ہر ممکن کام کرتے رہیں۔

ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے

ڈاکٹری کی تعلیم کا جو انتظام بدھان چندر رائے نے کیا تھا اس سے سبھی واقف ہیں۔ انھوں نے مشرق بعید میں ڈاکٹری مشن بھیجے اور مغربی بنگال اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں بہت سے میڈیکل کالج کھولے۔ ان باتوں سے عوام کی صحت کو بہتر بنانے کے لیے راستہ ہموار ہوا۔ اُس زمانہ میں حکومت اس قسم کے اداروں کی طرف توجہ نہیں دیتی تھی اس لیے ادارے قائم کرنے والوں کو عوامی چندے سے ہی کام چلانا پڑتا تھا۔ جادو پور کا ٹی۔ بی اسپتال، چترنجن سیوا سدن، آر۔ جی۔ کھار میڈیکل کالج، کملا نہرو اسپتال، وکٹوریہ انسٹی ٹیوشن اور چترنجن کینسر اسپتال جیسے اداروں کے علاوہ ڈاکٹر رائے نے اور بہت سے ادارے قائم کیے تھے۔

ڈاکٹر رائے کہا کرتے تھے " جب تک لوگ جسمانی اور دماغی طور پر صحت مند نہیں ہوتے 'سوراجیہ' ایک خواب ہی بنا رہے گا اور عوام اس وقت تک صحت مند نہیں ہو سکتے جب تک کہ مائیں صحت مند ہوں اور اپنے بچوں کی صحیح ڈھنگ سے دیکھ بھال کرنا نہ سیکھ لیں۔"

پردے کا رواج ابھی عام تھا۔ جہالت اور اندھے اعتقاد کی وجہ سے عورتیں اسپتالوں میں جانے کو تیار نہیں ہوتی تھیں۔ 1926 میں عورتوں اور بچوں کے لیے 'چترنجن سیوا سدن' قائم کیا گیا۔ ڈاکٹر رائے اور ان کے ساتھیوں کی ان تھک محنت کی وجہ سے یہ سیوا سدن سماج کے ہر طبقہ اور ہر فرقہ کے لوگوں کے لیے ایک مفید اسپتال بن گیا۔ انھوں نے عورتوں کو

نرسنگ اور سوشل ورک سکھانے کے لیے بھی ایک مرکز قائم کیا۔

1922 سے 1926 تک ڈاکٹر رائے کا 'تعلق کلکتہ میڈیکل جرنل' سے بھی رہا۔ وہ اس ادارے میں ایڈیٹر بھی تھے اور بورڈ کے ممبر بھی تھے۔ 1929 میں ہونے والی 'آل انڈیا میڈیکل کانفرنس' کے وہ صدر تھے۔ 1943 میں 'میڈیکل کونسل آف انڈیا' میں بھی انھوں نے اعزازی طور پر نائب صدر کی حیثیت سے کام کیا۔

سیاست کے میدان میں آنے سے پہلے ڈاکٹر رائے نے ڈاکٹری کی دنیا میں بہت سی ذمہ داریاں پوری کیں۔ 1916 میں ان کو کلکتہ یونی ورسٹی میں فیلو شپ ملی۔ کلکتہ یونی ورسٹی سے ان کا تعلق ان کی زندگی کے آخری سانس تک بنا رہا، ہاں 1930 میں کچھ عرصہ کے لیے یہ تعلق ٹوٹ گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وائس چانسلر نے طالب علموں پر سول نافرمانی تحریک میں حصہ لینے کے لیے پابندی لگادی تھی اور ڈاکٹر رائے نے اس حکم کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اپنا استعفیٰ دے دیا تھا۔

آسوتوش مکھرجی کے مشورہ سے، 1923 میں ڈاکٹر رائے نے بنگال لیجسلیٹو کونسل کے لیے الکشن لڑنے کا فیصلہ کیا۔ اُس غیر ملکی حکومت کے خلاف وہ ہمیشہ بڑے زوردار انداز میں بولتے رہے، جو چاہتی تھی کہ کلکتہ یونی ورسٹی کو حکومت کا ایک باقاعدہ اور باضابطہ ذریعہ کار بنادے۔ 1942 میں پرفل چندر رے 'نیشنل کونسل آف ایجوکیشن' کے صدر نہیں رہے تو ڈاکٹر رائے نے یہ ذمہ داری سنبھال لی۔ 16 ستمبر 1955 کو انھوں نے اسمبلی میں 'جادو پور یونی ورسٹی بل' پیش کیا۔ اس بل کے مطابق اس ادارے سے امتحان پاس کرنے والے طالب علموں کی حیثیت، کسی یونی ورسٹی سے امتحان پاس کرنے والوں کے برابر ہو گئی۔

کھڑگ پور میں 'انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی' قائم کرنے میں بھی انھوں نے بہت مدد دی۔ وہ اس ادارہ کے 'بورڈ آف گورنرس' کے چیئرمین تھے۔ ان کی اس حیثیت سے ادارہ کو بہت فائدہ پہنچا۔ رابندر ناتھ ٹیگور کے نظریات ڈاکٹر رائے کو بہت اچھے لگتے تھے۔ جب اس عظیم شاعر کی پیدائش کی یاد میں سو سالہ تقریبات منائی گئیں تو ڈاکٹر رائے نے 'رابندر بھارتی یونی ورسٹی' کے قیام کے سلسلہ میں بہت کام کیا۔

ڈاکٹر رائے کا خیال تھا کہ وہ نظام تعلیم بیکار ہے جس میں طالب علموں اور ان کے ماحول کو نگاہ میں نہیں رکھا جاتا۔ ان کا اس بات پر بھی پکا یقین نہیں تھا کہ ملک کی ترقی کی ذمہ داری آخرکار نوجوان ہی اٹھائیں گے۔ ان کا خیال تھا کہ نوجوانوں کے کندھوں پر ملک کے لیے خصوصی ذمہ داریوں کا بوجھ ہوتا ہے۔ اس لیے انھیں تفریحات، ہڑتالوں اور برت رکھنے جیسی باتوں میں اپنی توانائی برباد نہیں کرنی چاہیے بلکہ لوگوں کی خدمت کرنے کے لیے ان کو ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اس کام کے لیے ان کو طاقت ور جسموں اور تربیت یافتہ دماغوں کی ضرورت ہے۔

لکھنؤ یونی ورسٹی کے تقسیم اسناد کے جلسے (کانووکیشن) میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا "میرے نوجوان دوستو! اپنی شخصیت کی نشوونما اس انداز میں کرو کہ زندگی میں جو کام بھی کرنے کا تمھیں موقع ہے، تم لوگوں کے دماغوں پر اپنی شخصیت کی ایک گہری چھاپ چھوڑ جاؤ۔ آزادی کی لڑائی کے تم سپاہی ہو اور یہ آزادی تم کو جہالت، خوف، غریبی، بے چارگی اور مایوسی جیسی باتوں کے خلاف حاصل کرنی ہے۔ بے غرض ہو کر محنت کے ساتھ اپنے ملک کے لیے کام کرکے، تم ہمت اور امید کے ساتھ آگے بڑھ سکتے ہو...... یاد رکھو، اس تیز رفتار دنیا میں تم کو بھی تیزی سے آگے بڑھنا ہے ورنہ تم پچھڑ جاؤ گے۔"

28ر دسمبر 1956 کو کھڑگ پور میں تقریر کرتے ہوئے ایک جلسہ میں انھوں نے کہا تھا" میں نے طالب علموں سے کہا تھا کہ وہ خود اپنے دماغ سے سوچیں اور مشکلات پر قابو پانے کے لیے اپنا راستہ خود تلاش کریں۔ مشکلیں تو ہمیشہ آتی ہیں اور آئندہ بھی آتی رہیں گی، بلکہ میں تو اس بات سے خوش ہوتا ہوں کہ انسان کے راستہ میں مشکلیں آتی ہیں، کیوں کہ مشکلوں کے سامنے آنے سے انسان کے دماغ اور خیالات میں تیزی آتی ہے۔ جب انسان کے خیالات اور دماغ میں بیداری پیدا ہو جاتی ہے تو وہ اپنی مشکلوں کو حل کرنے کے لیے ذرائع بھی ڈھونڈ ہی لیتا ہے۔"

ڈاکٹر رائے اس بات کی حمایت کرتے تھے کہ پیشہ ورانہ تعلیم دی جائے۔ گانوؤں میں ترقی ہو اور گانوؤں کے علاقہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے یونی ورسٹیوں کا جال پھیل جائے۔ ڈاکٹر رائے ایک طرف اپنے کلچر کی اچھی باتوں کو قائم رکھنا چاہتے تھے اور دوسری طرف

سائنس اور معاشیات کے میدانوں میں بھی ترقی چاہتے تھے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انھوں نے دو نئی یونی ورسٹیاں قائم کیں۔ ان میں سے ایک یونی ورسٹی میں سائنس، تکنالوجی اور زراعت کی تعلیم دی جاتی تھی اور دوسری سماجی علوم اور آرٹس کی تعلیم کے لیے تھی۔ اس دوسری یونی ورسٹی کے مضامین میں رقص بھی شامل تھا۔ وہ سنسکرت کی لازمی تعلیم کو بھی ضروری سمجھتے تھے۔ کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ اس سے طالب علموں کو قومی تصور اور قومی تہذیب سے قریب رہنے کا موقع ملتا ہے۔

مختلف میدانوں میں

1942 میں ڈاکٹر رائے کلکتہ یونی ورسٹی کے وائس چانسلر بنائے گئے تھے۔ دوسری جنگ عظیم چل رہی تھی۔ جب ینگون پر جاپانیوں نے قبضہ کر لیا تو کلکتہ سے لوگ جاپانی بمباری کے ڈر سے بھاگنے لگے۔ تعلیم کے معاملہ میں اس سے خاص طور پر غلط اثر پڑا۔ اس افرا تفری کے عالم میں تعلیمی کام کو صحیح راستہ پر لانے کی ذمہ داری ڈاکٹر رائے کے کندھوں پر آپڑی تھی۔

دن رات کام کر کے انھوں نے اسکولوں اور کالجوں میں بم باری سے پناہ لینے کے لیے پناہ گاہیں بنوائیں۔ انھوں نے اسکولوں اور کالجوں کی کلاسوں میں کچھ ردو بدل بھی کیا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ چھوٹے بچوں کی تعلیم پر کوئی برا اثر پڑے۔ امتحانات کے لیے سینٹر یونی ورسٹی کے باہر بنائے گئے اور طالب علموں، استادوں اور اسٹاف کے دوسرے ممبروں کو راحت پہنچانے کے انتظامات کیے گئے۔

جس زمانہ میں وہ وائس چانسلر رہے، انھوں نے حکومت سے اصرار کیا کہ ہوائی فوج کی مختلف شاخوں کے لیے کلاسیں چلائی جائیں۔ ڈاکٹر رائے کا خیال تھا کہ فوجی ٹریننگ طالب علموں میں ڈسپلن کا جذبہ پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

ڈاکٹر رائے کلکتہ یونی ورسٹی کے سنڈیکیٹ اور سینیٹ کے ممبر تھے، بورڈ آف اکاؤنٹس کے صدر تھے اور وائس چانسلر بھی تھے۔ ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے 1944 میں یونی ورسٹی نے ان کو سائنس میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی۔

جنوری 1957 میں ڈاکٹر رائے انڈین سائنس کانگریس کے صدر بنے۔

ڈاکٹر رائے بڑے نرم مزاج کے آدمی تھے۔ وہ دوسروں پر چھا جانے کی کوشش کبھی نہیں کرتے تھے اور اپنے بارے میں گفتگو کرنے کی عادت ان میں نہیں تھی۔ وہ ایک کام کرنے والے انسان تھے اور کام کو کبھی ٹالتے نہیں تھے۔ ایک بار انھوں نے کہا تھا "جب کوئی کام مجھے سونپا جاتا ہے تو اسے دوسرے اہم سمجھیں یا نہ سمجھیں، میرے لیے فوری طور پر وہ بہت اہم ہو جاتا ہے۔ جب تک وہ کام پورا نہ ہو جائے مجھے چین نہیں پڑتا....... قوم کی جو بھی خدمت میں نے کی ہے، اس کی وجہ خاص طور پر یہی ہے کہ میں ہر کام کو پوری سنجیدگی کے ساتھ کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ بہار میں پیدا ہوئے تھے اور بیس سال کی عمر تک انھوں نے بہار میں رہ کر ہی تعلیم حاصل کی تھی۔ پھر جب وہ بنگال میں رہتے اور کام کرتے تھے تو اکثر آسام بھی جایا کرتے تھے۔ اس طرح ان کا خیال تھا کہ ان کا تعلق ان تینوں صوبوں سے تھا۔ وہ بڑے فخر کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ میں جو کچھ بھی ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ان تینوں صوبوں کے لوگوں کو جانتا ہوں اور میں نے ان کے ساتھ زندگی گزاری ہے۔ اس بارے میں ان کے خیالات بالکل صاف تھے کہ صوبوں کے درمیان آپسی جھگڑے ہونے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔

وہ کہا کرتے تھے "دوسرے مذہبوں اور فرقوں کے لوگوں سے اسی طرح میل جول اور دوستی رکھو جس طرح اپنے لوگوں کے ساتھ رکھتے ہو۔ ان کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس طرح کی سمجھ اور اس طرح کے سماجی تعلقات سے، صوبوں کے آپسی جھگڑوں کا حل نکالنے کے لیے بہترین راستہ ملتا ہے اور زندگی زیادہ دلچسپ اور بھرپور ہو جاتی ہے۔"

اپنی زندگی میں کام کے لمبے عرصہ کے دوران ڈاکٹر رائے نئے ہندوستان کے بہت سے لیڈروں سے ملے تھے۔ اور انھیں ان کے خیالات جاننے کا موقع ملا تھا۔ جب میاں مار (برما) کی منڈالے جیل سے رہا ہو کر سبھاش چندر بوس 1927 میں برما سے کلکتہ واپس آئے تھے تو ڈاکٹر رائے کو ان کو قریب سے سمجھنے کا موقعہ ملا تھا۔ سبھاش کا نعرہ تھا "آزادی ہی زندگی ہے"

اور اس نعرے نے ڈاکٹر رائے کے دماغ پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر سیاسی آزادی حاصل کر کے، لوگ معاشی غلامی اور آپس کی مہلک نفرت سے آزادی حاصل نہیں کر پاتے تب تک ان کا غلام رہنا ہی بہتر ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے، دوران انڈین نیشنل آرمی نے ہندوستان کے لیے جنگ کی تھی۔ "جے ہند" اور "جے بھارت" اس فوج کے نعرے تھے۔ ہر ذات اور ہر مذہب کے ہندوستانیوں نے ان نعروں کو ہندوستان کے اتحاد کے نعروں کی حیثیت سے تسلیم کر لیا تھا۔ ڈاکٹر رائے کا خیال تھا کہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھلا کر، ہندوستان کے لوگوں کو ہر میدان میں ہندوستان کی جیت کے لیے، بہادری کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیے۔

1920 کے بعد ڈاکٹر رائے نہرو خاندانی کے ایک ممبر کی طرح ہی ہو گئے تھے۔ موتی لال اور جواہر لال سے ان کی تعلقات میں بہت محبت اور خلوص تھا اور وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ پنڈت جواہر لال کو رس گلوں کا بڑا شوق تھا۔ جب بھی وہ کلکتہ آتے تھے ڈاکٹر رائے انھیں رس گلے بھجوایا کرتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے اکثر ہنسی مذاق بھی کیا کرتے تھے۔

ایک بار ڈاکٹر رائے، آئی۔ ٹی۔ کھڑگ پور کے ڈائریکٹر ایس۔ آر۔ سین اور پنڈت جی کو کار سے کلائی کنڈا جانا تھا۔ کار میں بیٹھتے وقت پنڈت جی نے ڈاکٹر رائے کی دھوتی اور شال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مذاق میں کہا "بدھان تم ڈھنگ کے کپڑے پہننا کب شروع کرو گے؟"

"میں کیا کر سکتا ہوں۔ ہم لوگ تو ہمیشہ سے اسی طرح کے کپڑے پہنتے چلے آئے ہیں" ڈاکٹر رائے نے مسکرا کر جواب دیا۔

دیش بندھو چترنجن داس نے ڈاکٹر رائے کو اس بات کے لیے راضی کر لیا کہ وہ "فارورڈ گروپ" کے اخباروں میں دلچسپی لیں۔ اس زمانہ میں اخبار نکالنا ایک کاروبار نہیں تھا اور نقصان ہونے کی صورت میں، اخبار چلانے والوں کو اپنی جیب سے ہی نقصان پورا کرنا پڑتا

تھا۔ 1934 میں ڈاکٹر رائے ''فارورڈ'' کے چیرمین بن گئے۔ ان کے زمانہ میں اس اخبار نے کانگریس کے مقصد اور بنگال میں چلنے والی انقلابی تحریک کی حمایت بڑے طریقے سے کی۔

ڈاکٹر رائے کی دل چسپی اخباروں اور نیوز ایجنسیوں کو ترقی دینے تک ہی محدود نہیں رہی۔ جب وہ کلکتہ یونی ورسٹی کے وائس چانسلر تھے تو انھوں نے وہاں صحافت (جرنلزم) کا کورس بھی شروع کیا تھا اور پھر 1951 میں باقاعدہ طور پر جرنلزم میں ڈپلوما کورس شروع ہو گیا تھا۔ وہ انڈین جرنلسٹ ایسوسی ایشن کے ممبر بھی تھے اور آگے چل کر جب وہ وزیر اعلیٰ بنے تب بھی ان کی یہ ممبرشپ چلتی رہی۔

ڈاکٹر رائے کی پوری زندگی میں کانگریس کے نظریات اور گاندھی جی کے فلسفہ کی جھلک ملتی رہی۔ گاندھی جی سچائی اور عدم تشدد میں یقین رکھتے تھے۔ یہ دونوں باتیں ڈاکٹر رائے کو اپنے بچپن میں اپنے ماں باپ سے ہی مل گئی تھیں۔ جب جون 1925 میں دارجلنگ میں گاندھی جی اور ڈاکٹر رائے کی ملاقات ہوئی تو ایک دم وہ ایک دوسرے کے دوست بن گئے۔ ڈاکٹر رائے نے دیکھا کہ گاندھی جی کے کردار میں وہی روحانی خوبیاں موجود ہیں جو خود ان کے ماں باپ نے ان کے اندر پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔

1933 میں پونا میں پرنا کٹی ون میں جب گاندھی جی نے اپنا برت شروع کیا تھا تو ڈاکٹر رائے ان کے ساتھ تھے۔ اس کے بعد جب 'ہندوستان چھوڑو تحریک' کے سلسلہ میں گاندھی جی نے گرفتار ہونے کے بعد اکیس دن کا برت شروع کیا تھا تو اپنی دیکھ بھال کے لیے ڈاکٹر رائے کو ہی اپنے ساتھ رکھا تھا۔ لیکن گاندھی جی نے دوا کھانے سے انکار کر دیا تھا کیوں کہ وہ ہندوستان میں بنی ہوئی نہیں تھی۔ انھوں نے اس موقع پر کہا تھا ''میں تم سے علاج کیوں کراؤں؟ کیا تم جس طرح میرا مفت میں علاج کرنے کے لیے آئے ہو اسی طرح ہندوستان کے چالیس کروڑ لوگوں کا علاج مفت کرتے ہو؟''

ڈاکٹر رائے نے جواب دیا تھا ''گاندھی جی یہ بات تو سچ نہیں ہے۔ میں نے زندگی میں اپنے سارے مریضوں کا علاج تو مفت نہیں کیا۔ لیکن اب میں بمبئی میں موہن داس کرم چندر

گاندھی کا علاج کرنے نہیں آیا ہوں بلکہ اس شخص کا علاج کرنے آیا ہوں جو میری نظر میں ہندوستان کے چالیس کروڑ لوگوں کی نمائندگی کرتا ہے۔"

"تم تو ضلع عدالت کے ایک گھٹیا وکیل کی طرح جرح کر رہے ہو" گاندھی جی نے فوراً جواب دیا تھا اور اس کے بعد انھوں نے نرمی سے کہا تھا "اچھا لاؤ دوائی لاؤ میں کھاؤں گا"۔

آئندہ سالوں میں ڈاکٹر رائے گاندھی جی کے گہرے دوست بن گئے اور ان کا علاج بھی کرتے رہے لیکن انھوں نے گاندھی جی کی باتیں آنکھیں بند کر کے کبھی نہیں مانیں۔ جب بھی وہ گاندھی جی کے خیالات یا پالیسی سے مطمئن نہیں ہوتے تھے تو ان سے خوب بحث کیا کرتے تھے۔

ایک اچھے منتظم اور شاندار لیڈر ہونے کے علاوہ ڈاکٹر رائے صحیح معنوں میں ایک مکمل انسان بھی تھے۔ زندگی بھر وہ غریبی اور بیماری کے خلاف لڑتے رہے لیکن اپنی روح کی گہرائیوں سے ابھرنے والے تقاضوں کی طرف سے وہ کبھی غافل نہیں رہے۔ نہ کبھی انھوں نے مایوسی کی بات سوچی اور نہ بھاری ذمہ داریاں ان کی ہنسی مذاق پسند کرنے والی طبیعت کو کچل سکیں۔ جب بات چیت کے دوران وہ لطیفے سناتے تھے اور بڑے دل چسپ انداز میں بولتے تھے تو ان کی گفتگو میں جادو کا اثر پیدا ہو جاتا تھا۔

1947 کا زمانہ تھا۔ پنڈت جی نے ڈاکٹر رائے کو یو۔ پی کا گورنر بنانے کی پیش کش کی لیکن ڈاکٹر رائے نے انکار کر دیا۔ اس موقع پر گاندھی جی نے مذاق کیا "بدھان! تم نے گورنر بننے سے انکار کر دیا ہے اب میں تم کو یور ایکسیلنسی کہہ کر نہیں بلا سکتا۔"

بدھان چندر نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا "کوئی بات نہیں گاندھی جی، میں اس سے بھی بہتر بات آپ کو بتاتا ہوں۔ میں 'رائے' ہوں اور بہت سوں سے میرا قد دو چار انچ اونچا ہی ہے اس لیے آپ مجھے 'یور رائل ہائی نیس' کہہ سکتے ہیں۔"

سیاسی میدان میں

ڈاکٹر رائے دیش بندھو کے بہت اچھے ساتھی تھے۔ 1925 میں ڈاکٹر رائے سیاست کے

میدان میں اترے اور بیرک پور کے انتخابی حلقہ سے 'بنگال کے لیجسلیٹو اسمبلی کے لیے آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑے ہوئے۔ انھوں نے بنگال کی عظیم شخصیت سریندر ناتھ بنرجی کو سیدھے مقابلہ میں ہرا کر جیت حاصل کی اور 42 سال کی عمر میں وہ بنگال کی سیاسی زندگی میں ایک اہم شخصیت بن گئے۔

کونسل میں آنے کے بعد وہ سوراج پارٹی کے ممبر تو نہیں بنے لیکن کونسل کے اجلاس میں وہ انھیں لوگوں کے ساتھ بیٹھتے تھے اور ان ہی کے ساتھ ووٹ دیتے تھے۔ سوراج پارٹی کانگریس کی اس جماعت کے خلاف تھی جو رفتہ رفتہ دستوری اصلاحات کے ذریعے آزادی کے لیے راستہ ہموار کرنا چاہتی تھی۔

شروع شروع میں ڈاکٹر رائے کسی سیاسی بحث میں شامل نہیں ہوتے تھے۔ ان کی سب سے زیادہ دلچسپی تو تعلیم ورڈاکٹری کے مسئلوں سے تھی۔ لیکن 1925 میں جب ڈھاکہ یونی ورسٹی بل پیش ہوا تو اس پر ہونے والی بحث میں انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور کہا کہ وہ چاہتے ہیں کہ ہر ڈویژن میں ایک یونی ورسٹی قائم ہو۔ انھوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ اعلیٰ تعلیم کے مسئلوں پر مجموعی طور پر غور کیا جائے۔ صحت اور علاج کے مسئلوں کا حل ڈھونڈنے کے سلسلے میں انھوں نے ہمیشہ بہت عمدہ مشورے دیے۔

1925 میں انھوں ہی نے ایک تجویز رکھی تھی کہ دریائے ہگلی میں گندگی بڑھنے کے مسئلہ پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی جائے اور یہ کمیٹی آنے والے زمانہ میں گندگی کو بڑھنے سے روکنے کے لیے طریقے بھی بتائے۔

24/ فروری 1926 کو انھوں نے پہلی بار کونسل میں ایک سیاسی تقریر کی اور پھر جب ایک بار بندھن ٹوٹ گیا تو پھر جلدی ہی وہ پارٹی کے ترجمان مقرر کردیے گئے اور پھر جب بھی انھیں سوراج پارٹی یا کانگریس کے اصولوں کو بیان کرنے کا موقع ملا وہ کبھی ہچکچائے نہیں۔ انھوں نے اپنی دوسری سیاسی تقریر 27/ جنوری 1947 کو کی اس تقریر میں انھوں نے

ایک مسلمان ممبر کی اس تجویز کی مخالفت کی تھی جو ایک مسلمان کو وزیر بنانے کے لیے پیش کی گئی تھی۔ اپنی تقریر میں انھوں نے یہ خطرہ ظاہر کیا تھا کہ اس طرح کی باتوں سے سیاست میں گروہ بندی اور فرقہ وارانہ جذبات پیدا ہو جائیں گے۔ ان کی تقریروں میں بہت وقار ہوتا تھا اور وہ کبھی بھی اپنے مخالف پر ڈھکے چھپے حملہ نہیں کرتے تھے۔

رفتہ رفتہ یہ بات ثابت ہو گئی کہ وہ لیجسلیٹو اسمبلی اور پارلیمنٹ میں شاندار طور پر بحث کر سکتے ہیں۔ دیش بندھو کی موت کے بعد 1927 میں وہ ڈپٹی لیڈر رہے۔

رہنمائی کے میدان میں ان کی صلاحیتوں کا لوہا سب نے مان لیا اور جب میئر بننے کی بات آئی تو قدرتی طور پر سب کی نظر ان پر ہی پڑی۔ 1931 میں جب میئر کا الکشن ہوا تو ان کے مقابلہ میں کوئی امیدوار آیا ہی نہیں اور اتفاق رائے سے ان کو ہی میئر چنا گیا۔ کلکتہ کارپوریشن کے لیے یہ بڑی مشکلات کا زمانہ تھا۔ نمک ستیہ گرہ چل رہا تھا اور یہ ستیہ گرہ سول نافرمانی کی تحریک کی ہی ایک شکل تھا۔ ڈانڈی مارچ شروع ہونے سے پہلے ہی سبھاش چندر بوس کو جیل بھیج دیا گیا تھا۔ جیسے ہی تحریک شروع ہوئی بنگال کے بہت سے اہم لیڈروں کے ساتھ میئر جے۔ ایم سین گپتا کو بھی جیل میں ڈال دیا گیا تھا۔ ایسے وقت میں کانگریس پارٹی کو ایک ایسی ممتاز شخصیت کی تلاش تھی جو جیل سے باہر رہ سکے اور کارپوریشن میں کانگریس کی ذمہ داریاں پوری کر سکے۔ اس کام کے لیے بھی ڈاکٹر رائے کو ہی ٹھیک سمجھا گیا۔ 31-1930 میں وہ کارپوریشن کے ایلڈرمین چنے گئے تھے اور 1933 میں دوبارہ ان کو میئر منتخب کیا گیا۔

ان کی رہنمائی کے پورے دور میں کلکتہ کارپوریشن نے مفت تعلیم، مفت علاج، بہتر سڑکوں، بجلی اور پانی کی اچھی سپلائی جیسے کاموں کی طرف زیادہ سے زیادہ دھیان دیا۔ یہ سہرا ان ہی کے سر ہے کہ انھوں نے ایسے قاعدے قانون بنائے جن کی رو سے اسپتالوں اور مفت علاج کرنے والی ڈسپنسریوں کو سرکار کی طرف سے مالی امداد ملنے لگی۔ جب وہ میئر تھے تو انھوں نے کارپوریشن میں کلرکوں کی بھرتی کے لیے مقابلہ کے امتحانات بھی شروع کیے گئے تھے۔ انھوں نے ہی کلکتہ میٹروپولیٹن پلاننگ آرگنائزیشن قائم کی تھی اور یہ ایک ایسا ادارہ تھا جس

نے آگے چل کر کلکتہ کی ترقی کے لیے منصوبہ بندی کی اور موثر قدم اٹھائے۔

پروگرام بنانے کے معاملہ میں ڈاکٹر رائے، دیش بندھو کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ہمیشہ عوام کی ہمدردی اور بھلائی کی بات سوچتے تھے اور جہاں تک ہو سکتا تھا اس سلسلہ میں ہر طرح سے مدد کرتے تھے۔ جب انھوں نے میئر کا عہدہ سنبھالا تو سبھی لوگ ان کی ہوشیاری، ان کی برداشت اور ان کی خوش اخلاقی کی تعریف کرنے لگے۔ یہاں تک کہ مخالف پارٹی کے ممبران بھی اُن کی ان خوبیوں کو سراہتے تھے۔

گاندھی جی کا اعتماد

مہاتما گاندھی اور ڈاکٹر بی۔ سی۔ رائے نے دیش بندھو کی یادگار میں چترنجن سیوا سدن بنانے کا منصوبہ بنایا۔ کلکتہ چھوڑنے سے پہلے گاندھی جی نے ڈاکٹر رائے کو ٹرسٹ کا سکریٹری مقرر کیا اور ان کو ٹرسٹ کا انتظام چلانے کا پوری طرح ذمہ دار بنادیا۔

اس عہدے پر آنے سے ان کی لیے کانگریس کا لیڈر بننے کا راستہ کھل گیا۔ دھیرے دھیرے ڈاکٹر رائے بنگال میں کانگریس سیاست میں شامل ہوگئے۔ 1928 میں ان کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ممبر چن لیا گیا۔ ڈاکٹر رائے آپسی جھگڑوں اور آپسی رقابت سے ہمیشہ دور رہتے تھے۔ ان کی ہوشیاری، سنجیدگی اور پارٹی کے لیے بے جا حمایت سے آزاد رہنے کی وجہ سے سبھی لیڈر ان سے بہت متاثر ہوئے۔

1929 میں انھوں نے بنگال میں سول نافرمانی کی تحریک کا انتظام سنبھالا۔ موتی لال نہرو ان کے خاموشی کے ساتھ کام کرنے کی صلاحیت سے بہت متاثر ہوئے اور 1930 میں ان کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کا ممبر بنادیا۔ بڑی وفاداری اور بے خوفی کے ساتھ انھوں نے کانگریس اور بغاوت پر آمادہ عوام کی خدمت کی لیکن جلد ہی کانگریس ورکنگ کمیٹی کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا۔ 26 اگست 1930 کو کانگریس کے صدر ڈاکٹر ایم۔ اے۔ انصاری، وٹھل بھائی پٹیل اور کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ ڈاکٹر رائے کو دہلی میں گرفتار کرکے علی پور کی سنٹرل جیل میں بھیج دیا گیا۔ جیل کے اسپتال میں ان کی ڈیوٹی لگائی گئی تو انھوں نے وہاں بھی دل لگا

کر کام کیا۔ جلد ہی جیلر اور دوسرے قیدی ان پر بھروسہ کرنے لگے۔ ان کی خدمت کا خیال رکھتے ہوئے ان کی سزا میں چھ ہفتوں کی کمی کر دی گئی اور جنوری 1931 میں ان کو جیل سے رہا کر دیا گیا۔

1934 میں ڈاکٹر بی۔ سی۔ رائے اور کچھ دوسرے رہنماؤں کو ایسا لگنے لگا کہ سول نافرمانی کی تحریک ہلکی پڑ گئی ہے۔ ڈاکٹر انصاری کے ساتھ مل کر انھوں نے تجویز پیش کی کہ اس تحریک کو ختم کر دیا جائے اور اس کی بجائے سوراج پارٹی کو پھر سے زندہ کیا جائے۔ سوراجیہ پارٹی کا نام "نئی سوراج پارٹی" رکھنے کی بھی تجویز تھی۔

جولائی 1934 میں پٹنہ میں ہونے والی آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی میٹنگ میں انھوں نے تجویز رکھی کہ 'کیوں نہ ہم مرکزی اسمبلی کے لیے الکشن لڑیں۔ اس طرح لارڈ ولنگڈن کا کانگریس کو ناکام بنانے کا خفیہ منصوبہ خود ہی ناکام ہو جائے گا۔"

گاندھی جی اسی طریقہ سے کام کرنے کے لیے راضی ہو گئے اور انھوں نے سول نافرمانی کی تحریک ختم کر دی۔ اس تحریک کو چلانے کی بجائے انھوں نے ڈاکٹر رائے اور ڈاکٹر انصاری کی کونسل میں داخل ہونے کی بات مان لی۔ موتی لال نہرو اور دیش بندھو پہلے ہی ڈاکٹر رائے کو ذمہ دار بنانے کی بات کہہ چکے تھے۔

اکتوبر 1934 میں ڈاکٹر رائے صوبہ بنگال کی کانگریس کمیٹی کے صدر منتخب کر لیے گئے۔ لیکن چار مہینے بعد ہی انھوں نے استعفیٰ دے دیا کیوں کہ انھوں نے محسوس کیا کہ اُن کی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں میں سیاسی کام رکاوٹیں پیدا کر رہا تھا۔

اب وہ اپنی ڈاکٹری کی پریکٹس پر پوری توجہ دینے لگے کیوں کہ سیاست کو وہ اتنا اہم نہیں سمجھتے تھے کہ اپنا پورا وقت اسی کے کاموں میں لگا دیں۔ ان کا اصول تھا کہ "اپنے سے پہلے دوسروں کی خدمت کرو" اور شاید ان کے اسی نظریہ کا نتیجہ تھا کہ وہ سیاسی اسٹیج پر لگاتار ابھر کر سامنے نہیں آئے۔ جب کبھی بھی ان کو وقت ملتا سیاست کے میدان میں اتر آتے تھے۔ انھوں نے پارٹی میں کوئی نمایاں حیثیت یا کوئی عہدہ حاصل کرنے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ ہاں جب کبھی

ان کی ضرورت محسوس ہوتی اور پارٹی انھیں کوئی ذمہ داری سونپنا چاہتی تو وہ اپنی خدمات پیش کر دیتے تھے۔

اپریل 1939 میں سبھاش چندر بوس نے انڈین نیشنل کانگریس کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ گاندھی جی ڈاکٹر رائے کو کانگریس کی ورکنگ کمیٹی میں شامل کرنا چاہتے تھے لیکن گروہ بندی کی کشمکش کی وجہ سے ایسا نہیں ہو سکا۔ ڈاکٹر رائے پارٹی کے کاموں میں عملی طور پر شریک ہونے سے بچتے رہے اور اپنی دوسری ذمے داریوں کے ساتھ یونی ورسٹی اور کارپوریشن کے کاموں میں لگے رہے۔

دوسری جنگ عظیم شروع ہونے پر ڈاکٹر رائے اور کانگریس کے درمیان اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ ڈاکٹر رائے نے کانگریس ورکنگ کمیٹی سے الگ ہونے کی درخواست خود ہی کی تھی۔ 1940 اور 1941 میں واقعی وہ ورکنگ کمیٹی سے الگ تھلک رہے۔ گاندھی جی کی مرضی سے انھوں نے مناسب نوجوان ڈاکٹروں کی فوج میں بھرتی کرنے کے لیے حکومت کی درخواست مان لی۔ ڈاکٹر رائے نے فوج میں کام کرنے والے ڈاکٹروں کے مفادات کا تحفظ کیا اور ان کو وہ فائدے دلائے جنھیں پہلی جنگ عظیم کے دوران نہیں مانا گیا تھا۔

1947 میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان کی تقسیم کا اعلان کر دیا۔ ڈاکٹر رائے کا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ وہ کوئی عہدہ قبول کریں۔ وہ تو اپنا ڈاکٹری کا کام پوری توجہ کے ساتھ کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے مرکزی کابینہ میں شامل ہونے سے انکار کر دیا لیکن یہ بات مان لی کہ کسی ترقیاتی اسکیم میں وہ بغیر کوئی عہدہ لیے کام کریں گے۔ بنگال لیجسلیٹو پارٹی کے ممبران وزیر اعلیٰ ڈاکٹر پی۔ سی۔ گھوش کی رہنمائی میں تبدیلی لانا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر بی۔ سی۔ رائے کو بتائے بغیر انھوں نے اپنے نئے لیڈر کے لیے ان کا نام تجویز کر دیا۔

اس زمانہ میں گاندھی جی کا دوسرا برت چل رہا تھا۔ ڈاکٹر رائے ان کی دیکھ بھال کرنے کے لیے دہلی گئے ہوئے تھے۔ 18 / جنوری 1948 کو جب گاندھی جی کا برت ختم ہو گیا تو ڈاکٹر رائے نے ان کو بنگال لیجسلیٹو پارٹی کے فیصلہ کے بارے میں بتایا اور یہ بھی بتایا کہ وہ پارٹی کا رہنما

بن کر وزارت بنانے کی کوئی خواہش نہیں رکھتے۔ گاندھی جی نے کہا کہ اگر اسمبلی میں کانگریس کے ممبران کو ان کی ضرورت ہے تو ان کا یہ فرض ہے کہ وہ ان کی خواہش کو پورا کریں۔

ڈاکٹر رائے نے کہا "میں اس شرط پر یہ بات ماننے کو تیار ہوں کہ پارٹی میرے معاملات میں کوئی مداخلت نہیں کرے گی۔ میں قابلیت اور صلاحیت کی بنیاد پر وزیروں کا چناؤ آزادانہ طور پر کروں گا اور ان کی پارٹی کی ممبر شپ کو ان کے انتخاب کے لیے اہم نہیں سمجھوں گا۔"

کانگریس لیجسلیٹو پارٹی اور کانگریس کمیٹی نے ان کی یہ شرط مان لی تب کہیں جا کر انھوں نے اس ذمہ داری کو قبول کیا۔ 23/ جنوری 1948 کو گورنر سی۔ راج گوپال آچاریہ نے ان کو اس عہدہ کی قسم دلائی۔

وزیر اعلیٰ

ڈاکٹر رائے وزیر اعلیٰ بن گئے لیکن وہ اس قسم کے آدمی نہیں تھے جو مشکلات یا مخالفت سے گھبرا جائے۔ بنگال کے سامنے بہت سے مسئلے تھے۔ عوام میں بے چینی عام تھی، روپیہ پیسہ کی کمی تھی، خوراک اور روزگار کی کمی تھی اور مشرقی پاکستان سے بھاگ کر بڑی تعداد میں لوگ پناہ لینے کے لیے آرہے تھے۔ افراتفری کے اس عالم میں مشکلات اور بڑھ گئیں اور بنگال میں قانون اور امن کا معاملہ خطرہ میں پڑ گیا۔

ایسے حالات میں ڈاکٹر رائے نے پورا دل لگا کر کام کیا۔ سب سے پہلے انھوں نے پارٹی کے لوگوں کے آپسی جھگڑے ختم کرا کے ان میں اتحاد اور ڈسپلن پیدا کیا اور اس کے بعد مشکلات کو حل کرنے کے طرف توجہ دی۔ بڑے ٹھنڈے دماغ اور صبر کے ساتھ انھوں نے ہر مصیبت کا سامنا کیا اور تین سال کے اندر امن و قانون کے راستہ میں آنے والے خطرات کو ختم کر دیا۔ افراتفری کا دور ختم ہو گیا اور ماحول میں ٹھہراؤ آگیا۔ لوگ قانون کی عزت پھر سے کرنے لگے۔ اس تمام عرصہ میں انھوں نے اپنے عہدہ کا وقار بنائے رکھا۔ ایک بار انھوں نے لوگوں سے کہا تھا " صلاحیت ہمارے اندر موجود ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ اگر ہم

مستقبل میں یقین رکھتے ہوئے، مضبوط ارادے کے ساتھ جم کر کام کریں تو مجھے یقین ہے کہ ہماری کامیابی لازمی ہے۔ آج مشکلات بہت زیادہ ہیں اور ایسا لگ رہا ہے کہ ان کا کوئی حل نہیں ہے۔ لیکن (اگر) ہم نے مل جل کر کام کیا، اپنے ذہنوں کو صاف رکھا اور خود پر پورا قابو رکھا تو یہ مشکلات ہم کو آگے بڑھنے سے روک نہیں سکیں گی۔"

ڈاکٹر رائے کا علم بہت وسیع تھا۔ وہ ہر کام کو بہت صحت اور عمدگی کے ساتھ کرتے تھے اور ان کے دماغ میں حیرت انگیز ترتیب موجود تھی۔ ان ہی خصوصیات میں ان کی توانائی کا راز چھپا تھا۔ وہ ہر بات کو جلد سمجھ لیتے تھے، ان کے دل میں خلوص تھا، بڑی مضبوطی لیکن ہمدردی کے ساتھ وہ ہر صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے اور ہر معاملہ میں انسانیت کی خوبیوں کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ اپنے کام کرنے کے اسی اچھے انداز کے ساتھ وہ چودہ سال تک بنگال کی رہنمائی کرتے رہے۔

4/ فروری 1961 کو قوم نے ان کو "بھارت رتن" کا اعزاز دیا۔

اور ایک دن ڈاکٹر رائے کو دل کا دورہ پڑا اور انھیں امید نہیں رہی کہ وہ پھر سے پوری طرح صحت مند ہو سکیں گے۔ اس احساس سے ان کو سخت مایوسی بھی ہوئی لیکن پھر اچانک ایک خیال ان کے دماغ میں بس گیا۔ اگر میری خدمات کی ضرورت ہے تو خدا مجھے زندہ بھی رکھے گا اور صحت مند بھی۔ پھر جیسے ہی ان کی حالت سدھری بڑی ہمت کے ساتھ انھوں نے اپنی ذمہ داریاں پھر سنبھال لیں۔

ان کو دوبارہ دل کا دورہ پڑا اور ان کی حالت بدتر ہو گئی۔ اپنی موت سے چند دن پہلے ڈاکٹر رائے نے وہ مکان جس میں وہ رہتے تھے، ایک نرسنگ ہوم چلانے کے لیے دے دیا۔ ان کی ماں کا نام اگھور کمانی دیوی تھا۔ انھیں کے نام پر اس نرسنگ ہوم کا نام رکھا گیا۔

"کل میری سالگرہ کا دن ہے"۔ انھوں نے اپنی دیکھ بھال کرنے والے ایک ڈاکٹر سے کہا "ہو سکتا ہے میں کل آؤں۔"

اور اس روز پہلی جولائی 1962 کی صبح کو ہر روز کی طرح دو گھنٹے تک انھوں نے اپنے مریضوں کو دیکھا اور حکومت کا کام پورا کیا۔ اس کے بعد انھوں نے "برہمو گیت" نام کی کتاب لی اور اس میں سے کچھ حصہ گا کر پڑھا۔ اس کے تقریباً گیارہ گھنٹے بعد وہ اس دنیا سے کوچ کر گئے۔

ان کی یاد مین بہت سے انعامات کا سلسلہ جاری کیا گیا ہے۔ بی۔ سی۔ رائے نیشنل اوارڈ کی شروعات 1976 میں ہوئی تھی۔ یہ انعامات ڈاکٹری، سیاسیات، سائنس، فلسفہ، ادب اور فنون لطیفہ کے لیے دیا جاتا ہے۔ یہ وہ موضوعات ہیں جو ڈاکٹر رائے کو دل کی گہرائیوں سے پسند تھے۔ ایک انعام میڈیکل سائنس پڑھانے والے بہترین استاد کو بھی دیا جاتا ہے اور ایک میڈیکل ریسرچ کے لیے وقف ہے۔ دہلی میں چلڈرن بک ٹرسٹ میں 1967 میں بچوں کے لیے ڈاکٹر بی۔ سی۔ رائے میموریل لائبریری اور ریڈنگ روم بھی قائم کیا گیا تھا۔

عوامی زندگی کے بہت سے میدانوں میں ڈاکٹر رائے نے کام کیا اور کئی مقاصد حاصل کرنے کے لیے انھوں نے جدو جہد کی۔ اس قسم کے کاموں میں کبھی انھوں نے تھوڑا کام کیا اور کسی کام میں اہم رول ادا کیا مگر انھوں نے جو کچھ بھی کیا اس میں اپنی بہترین صلاحیتوں کا استعمال کیا۔ واقعی ان کی زندگی جدو جہد اور محنت سے بھرپور ایک لمبا اور بامقصد سفر تھی۔

ونائک دامودر ساورکر

نیتا بیری

"ہم ایک ایسے، عالمی ملک یا حکومت کو ماننے والے ہیں جو تمام بنی نوع انسان کو گلے لگائے اور اُس کے تمام شہری مرد اور عورتیں اُس کے لیے کام کریں اور اس زمین، اس آسمان، اس سورج اور اس روشنی کے پھلوں میں برابر کے حصے دار ہوں جن سے یہ مادر و پدر ہند بنے ہیں۔ ان کے علاوہ بنی نوع انسان کی کوئی تقسیم یا کوئی امتیاز محض مصنوعی ہیں"۔

ویر ساورکر

ونائک دامودر ساورکر

پہلی جولائی 1910 کی بات ہے۔ ایس۔ایس ۔ موریہ نام کا سمندری جہاز لندن سے ہندوستان کے لیے روانہ ہوا۔ جہاز میں ایک مشہور شخص سوار تھا۔ جس پر ہتھیار بند فوجیوں کا پہرہ تھا۔ اس پر الزام تھا کہ اس نے ایک قتل کے معاملہ میں مدد کی تھی، باغیانہ تقریریں کی تھیں اور شہنشاہ برطانیہ کے خلاف اعلان جنگ کیا تھا۔ مقدمہ چلانے کے لیے اس شخص کو ہندوستان لایا جارہا تھا۔

جہاز کے نچلے حصہ میں ایک اندھیرے گھٹے ہوئے کیبن میں وہ بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں مایوسی اور غصہ کی جھلک صاف دکھائی دے رہی تھی۔ ہندوستان میں اس کے چھوٹے سے بیٹے کی موت ہوچکی تھی اور اس کے دونوں بھائی جیل میں ڈال دیے گئے تھے۔ بڑے الم ناک حالات ۔تھےاس کے سامنے۔

اس نے اپنے پہرے داروں پر نظر ڈالی جواس کی سخت نگرانی کررہے تھے۔وہ نہیں چاہتا تھا کہ پہرے داروں کواحساس ہو کہ وہ اتنااداس ہے۔اس نے اسکاٹ لینڈیارڈ کے انسپکٹر پارکر سے بات چیت کرنی شروع کردی لیکن اس کے دماغ میں خیالات کی آندھی سی چل رہی تھی۔ کیا بھاگ نکلنا ممکن ہے؟ ... ؟میں کسی مناسب موقع پر جہاز کی دیوار میں بنی چھوٹی کھڑکی سے سکڑ سمٹ کر باہر نکل ہی جاؤں' وہ جانتا تھا کہ کھڑکی سے سمندر میں کود کر، ساحل تک تیرنا خودکشی سے کچھ کم نہ ہوگا، لیکن بھاگ نکلنے کے خیال نے اس کے دماغ کو بالکل جکڑلیا۔

کچھ دن بعد اس جہاز کے انجن میں اچانک کوئی خرابی پیدا ہوگئی اور مرمت کے لیے مارسلیز

میں لنگر ڈالنا ضروری ہو گیا۔ نوجوان مسافر کا دل اچھل کر جیسے حلق میں اٹک گیا۔ کیا اس کا پیغام اس برِ اعظم میں اس کے ہندوستانی ساتھیوں تک پہنچ چکا ہے؟ کیا وہ اُسے بچانے کے لیے آئیں گے؟ جب تک جہاز لنگر ڈالے کھڑا رہا دس پہرہ دار اس کو گھیرے رہے۔

اگلے دن وہ صبح سویرے باتھ روم گیا۔ دو پہرے دار اب وقت بھی اس کی نگرانی کر رہے تھے۔ باتھ روم میں داخل ہوتے ہی اس نے اندر سے کنڈی لگالی اور اپنی قمیص اتار کر اس سوراخ کے شیشے کو ڈھک دیا جس سے اندر جھانک کر پہرے دار اُسے دیکھ سکتے تھے۔ بس اب ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس نے باتھ روم کی دیوار میں بنی چھوٹی سی کھڑکی کھولی اور سکڑ سمٹ کر باہر نکل گیا۔ ''آزادی کی دیوی کی جے'' اس نے آہستہ سے نعرہ لگایا اور نیچے سمندر میں کود پڑا۔

بد قسمتی سے ایک پہرے دار نے اسے فرار ہوتے دیکھ لیا اور وہ چلانے لگا'' پکڑو پکڑو، وہ نکل بھاگا ہے''۔ جیسے ہی اس کے فرار کی خبر پھیلی جہاز میں ہنگامہ مچ گیا۔

قیدی ساحل تک پہنچنے کے لیے تیزی سے ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔ گولیوں کی ایک بوچھار آئی لیکن وہ گھبرایا نہیں اور آخر کار مارسیلیز بندرگاہ کی کھڑی چڑھائی والے کونے تک پہنچ ہی گیا۔ پانی میں شرابور اور تھکن سے چور وہ لڑکھڑاتا ہوا گھاٹ تک پہنچ گیا۔ اُسے پکڑنے کے لیے لوگ اس کے پیچھے آرہے تھے۔ وہ بھاگ کر بندرگاہ کے علاقہ سے باہر نکل آیا، لیکن اس کے ساتھی تو وہاں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ یہ سچ مچ بڑی مایوسی کی بات تھی۔ اس کے سامنے سے ٹیکسیاں اور ٹرامیں گزر رہی تھیں لیکن اس کی جیب میں تو ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔

اب تک برطانوی سپاہی اس کے پاس پہنچ گئے تھے۔ انھوں نے پانی میں شرابور اس شخص کو پکڑ لیا اور اپنی جیت کے نشہ میں چور، وہ اس کو گھسیٹتے ہوئے جہاز تک لے گئے۔

فرانسیسی کمشنر جہاز پر پہنچ گیا اور انسپکٹر پار کر نے اسکاٹ لینڈ یارڈ کو تار کے ذریعہ یہ پیغام بھیج دیا۔ ''قیدی نے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ اس کو پکڑ لیا گیا ہے۔ رپورٹ بھیجی جارہی ہے۔'' ایس۔ ایس۔ موریہ بمبئی کے لیے روانہ ہو گیا ہے۔ اس نڈر انقلابی کے اس بے جگری کے ساتھ فرار ہونے کی کوشش پر ساری دنیا واہ واہ کرنے لگی۔ یہ بہادر تھے ونائک دامودر ساورکر

جنھوں نے برطانوی طاقت کو للکارنے کی ہمت کی تھی۔

ہندوستانی اس شخص کو "ویر" ساورکر کہا کرتے تھے۔ مگر اس ویر نے اپنے فرار کی کوشش کو کوئی بہت بڑا کمال نہیں سمجھا۔ ہاں ایک چھوٹے سے گھٹے ہوئے کیبن میں ہتھکڑی میں جکڑے انھیں اپنی زبردست ہار کا دکھ ضرور تھا۔

بچپن

ونائک دامودر ساورکر 28/ مئی 1883 کو ،ناسک کے قریب بھاگ پور گاؤں میں ایک اونچے خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے خاندان والے ساورکر ذات کے تھے۔ یہ لوگ بہت زمانے سے سنسکرت کے عالم اور زمیندار چلے آرہے تھے۔

ونائک دامودر کے والد کا نام دامودر پنت ساورکر تھا اور ان کی ماں کا نام تھا رادھا بائی۔ گنیش (بابا راؤ)، ونائک ،مینا بائی اور نارائن ان کی اولاد تھے۔ ان سارے بچوں کو انھوں نے علم سے محبت کرنے کا وہی شوق دینے کی کوشش کی جو خود ان کو تھا۔ دامودر پنت ہومر کی "ایلیڈ" شواجی اور دوسرے مراہٹہ راجاؤں کی فتوحات پر لکھی گئی رزمیہ نظموں کے بہترین بند اکثر گنگنایا کرتے تھے۔ رادھا بائی نے بابا راؤ کو رامائن اور مہابھارت آواز کے ساتھ پڑھنا سکھادیا تھا۔ اور وہ ان عظیم کتابوں کے باب کے باب رات کو سونے سے پہلے پڑھا کرتے تھے۔ باقی بچے جب یہ سنتے تو تاریخ اور بہادروں کے قصے، کسی فلم کی طرح ان کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتے تھے اور وہ ان میں کھو جاتے تھے۔

ونائک ایسے ماحول میں رہ رہے تھے اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی کہ بہت چھوٹی سی عمر میں ہی انھوں نے غیر معمولی طور پر کافی علم حاصل کرلیا تھا۔ وہ کتابوں کی پہلے صفحہ سے آخری صفحہ تک پڑھ ڈالتے تھے۔ ابھی وہ دس سال کے بھی نہیں ہوئے تھے کہ ان کی نظمیں ایک مقامی اخبار میں شائع ہونے لگیں۔ بچپن میں، زبردست یادداشت اور علم حاصل کرنے کی پیاس کے علاوہ، ان کے مزاج میں تیزی بھی بہت زیادہ تھی اور وہ زندہ دلی سے بھرپور اور شوخ حرکتیں کرتے رہتے تھے۔ لڑکپن میں وہ کافی خوب صورت بھی تھے۔

1893ا میں یو۔پی کے اعظم گڑھ شہر میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے اور اس کے بعد بمبئی بھی فرقہ وارانہ جھگڑوں کی آگ میں جلنے لگا۔ ونائک پر ان فسادات کا گہرا اثر پڑا اور انھوں نے اپنے اسکول کے کچھ ساتھیوں کو حملے کا مقابلہ کرنے کی تربیت دے کر ایک ٹولی بنالی۔ اس ٹولی میں انھوں نے کافی جوش اور جذبہ بھر دیا تھا۔ اپنے بڑے بھائی بابو راؤ کے ساتھ ان کو ناسک کے شواجی اسکول میں داخل کرادیا گیا۔ تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ ان کے گھرانے پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ان کی ماں ہیضہ کا شکار ہو گئیں۔ ونائک کی عمر اس وقت نو سال کی تھی۔ دامودر پنت اپنے غمزدہ بچوں کی دیکھ بھال میں جی جان سے لگ گئے۔

1890 کی دہائی ہمارے ملک کی تاریخ میں ایک بڑا خراب دور تھا۔ انگریز سیاسی طور پر ہندوستانیوں کو غلط طریقے سے کچل رہے تھے اور اس ملک کی دولت کو لوٹ رہے تھے۔ ہندوستانیوں میں اس وجہ سے غصہ بڑھتا جارہا تھا۔ اس زمانہ میں آرمس ایکٹ پاس ہوا اور ہندوستانی پریس پر بہت سی پابندیاں لگادی گئیں۔ ابھی تک ہندوستان میں رہنے والے انگریزوں کے خلاف، ہندوستانی مجسٹریٹوں کی عدالت میں مقدمے چلائے جاسکتے تھے۔ حکومت نے البرٹ بل کے ذریعے اسے اسی زمانہ میں ختم کردیا تھا۔ ان سب باتوں سے ہندوستانیوں کے جذبات اور بھی مشتعل ہو گئے۔ ہندوستانی سیاست میں نرم رویہ رکھنے والے رہنماؤں نے یہ مانگ کی کہ ہندوستان میں بہتر اصلاحات کی جائیں لیکن بال گنگادھر تلک نے گانوؤں اور شہروں میں رہنے والے عوام کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔

مہاراشٹر کے لیے بھی یہ بڑی مشکلوں کا دور تھا۔ بے رحمی کے ساتھ ہندوستانیوں کو دبائے جانے، برطانوی سپاہیوں کی زیادتیوں اور طاعون (پلیگ) کی وبا پھیل جانے سے عوام کی مصیبتیں اور بھی بڑھ گئیں۔ اس سب کے باوجود ملکہ وکٹوریہ کی حکومت کے پچاس سال پورے ہونے کی خوشی میں بے حس انگریزی حکومت نے 1887 میں ملکہ وکٹوریہ کی ڈائمنڈ جوبلی منائی اور اس کی تقریبوں پر ضرورت سے زیادہ پیسہ خرچ کیا۔

پونا کے ایک چاپیکر خاندان کے تین بھائیوں نے ڈائمنڈ جوبلی منانے پر غصہ سے بھڑک کر مسٹر آئیرسٹ اور برطانوی پلیگ کمشنر کو قتل کرڈالا۔ پلیگ کمشنر ہندوستانیوں کے ساتھ بڑی سختی سے پیش آتا تھا۔ اسی لیے لوگ اس کو "پریشان کرنے والا، نکما اور ظالم" کہا کرتے تھے۔

گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ تینوں چاپیکر بھائیوں کو پھانسی دے دی گئی۔ اس طرح وہ اس انقلابی تحریک کے لیے شہید ہو گئے جو مہاراشٹر میں پھیلتی جا رہی تھی۔ ان کی شہادت سے اور بہت سے نوجوانوں کی ہمت بڑھی اور وہ اپنی بہادری کے جوہر دکھانے کے لیے تحریک میں شامل ہو گے۔

نوجوان رہنما

ونائک کے والد اور چچا 1899 میں پلیگ کا شکار ہو گئے۔

ونائک کو کچھ کام کیے بغیر چین ہی نہیں پڑتا تھا۔ انھوں نے نوجوانوں کی ایک ٹولی بنائی اور اس کا نام ''متر میلا'' رکھا۔ اس ٹولی میں وطن سے سچی محبت رکھنے والے نوعمر لڑکے شامل تھے۔ اس ٹولی میں خفیہ طریقہ سے صرف ان ہی لوگوں کو شامل کیا جاتا تھا جن میں کام کرنے کی بہترین صلاحیت ہوتی تھی۔

ونائک ایک ایسے لیڈر تھے جن کی طرف دوسرے لوگ خود بخود کھنچ آتے تھے۔ دوسروں میں ہمت اور جوش کی روح پھونک دینے والے اس خوب صورت نوجوان نے اپنی ٹولی میں شامل بہادر نوجوانوں کے دل میں یہ جذبہ پیدا کر دیا کہ وہ ''ہندوستان کو مکمل طور پر سیاسی آزادی'' دلانے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیں۔ ونائک آزادی حاصل کرنے کے لیے ہتھیار بند انقلاب تک کے قایل تھے۔ سخت جسمانی محنت کے ذریعہ ''متر میلا'' میں شامل نوجوان اپنے جسم کو بہت مظبوط بنا لیتے تھے اور ناسک شہر میں مختلف قسم کے کام کیا کرتے تھے۔ چاہے جتنا بھی مشکل کام ہو ونائک خود اس میں شامل ہوتے تھے۔ وہ اور ان کے دوست طاعون سے مرے لوگوں کو شمشان گھاٹ تک لے جانے کا کام بھی کر دیتے تھے۔ دھوتی، جیکٹ اور ٹوپی پہنے ہوئے ونائک کو سبھی لوگ جانتے تھے اور ان سے پیار کرتے تھے۔ وطن سے سچی محبت رکھنے والے سبھی لوگ ان کے ساتھی تھے۔ ان کے یہاں مذہب یا ذات پات کے فرق کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

ونائک نے اپنی شاعری بھی اپنے وطن کے لیے وقف کر دی تھی۔ اپنی ایک نظم میں انھوں

نے ''آریہ بھائیوں! بیدار ہو جاؤ'' پر زور دیا تھا۔ واقعی وہ غیر معمولی ذہانت کے مالک تھے۔ وہ ایک زبردست مصنف بھی تھے اور مقرر بھی۔ انھوں نے ''سب سے بڑا پیشوا'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس پر ان کو انعام بھی ملا تھا۔ بعد میں بمبئی یونی ورسٹی نے اس مضمون کو میٹریکولیشن امتحان کے نصاب میں بھی داخل کر لیا تھا۔

ان تمام باتوں کے باوجود وِنائک میں گہرائی سے سوچنے کی عادت تھی۔ دوسروں سے ملنے جلنے کے معاملہ میں بھی زیادہ بے تکلفی نہیں برتتے تھے۔ کبھی کبھی وہ بالکل تنہائی میں رہنا چاہتے تھے اور اس بات کو وہ اپنے ''دماغ کی پارلیمنٹ کا اجلاس کرنا'' کہتے تھے۔ گھر کے معاملات اور ذمہ داریوں کا بوجھ بابوراؤ کے کندھوں پر رہتا تھا۔ انھوں نے اپنے بھائیوں کی پرورش اور دیکھ بھال کرنے کی خاطر اپنی ذاتی خواہشوں کو بھی قربان کر دیا تھا۔ وہ دیکھتے تھے کہ ان کے بھائی وِنائک میں غیر معمولی صلاحیتیں موجود ہیں اس لیے وہ مشکلوں کے باوجود وِنائک کو یونی ورسٹی میں تعلیم دلانا چاہتے تھے۔

میٹریکولیشن کا امتحان دینے سے چند مہینے پہلے مارچ 1901 میں، وِنائک کی شادی یمنا بائی سے کر دی گئی۔ یمنا بائی ان کے ایک پرانے خاندانی دوست رام چندر تریامبک چپ لنکر (بھاؤ صاحب) کی بیٹی تھیں۔ چپ لنکر نے بابوراؤ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ وِنائک کو یونی ورسٹی میں پڑھانے کے سلسلے میں مدد کریں گے۔ اس بات سے بابوراؤ کے دماغ پر جو بوجھ تھا وہ ہلکا ہو گیا۔

1902 میں وِنائک ساورکر نے پونہ کے فرگوسن کالج میں داخلہ لے لیا۔ پونہ ان دنوں نیشنلسٹ لوگوں کا گڑھ بنا ہوا تھا۔ اور ان وطن پرستوں میں مہادیو گووند راناڈے، گوپال کرشن گوکھلے اور بال گنگادھر تلک بھی شامل تھے۔

وِنائک کی شخصیت میں بہت کشش تھی اور وہ پیدائشی لیڈر تھے۔ ان خصوصیات کے وجہ سے ان کے کالج والے بہت جلد ان سے متاثر ہو گئے۔ ان کے پروفیسر حالاں کہ ان کے انقلابی خیالات کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن ان کی قابلیت کی تعریف وہ بھی کرتے تھے۔ ہوسٹل میں رہتے ہوئے انھوں نے کچھ ایسے دوست بنا لیے تھے جن کے دل میں اُن ہی جیسے ارادے

اور امیدیں کروٹیں لے رہی تھیں۔ یہ سب دوست ایک ہی طرح کے کپڑے پہنتے تھے اور سودیشی چیزیں استعمال کرتے تھے۔ جلد ہی یہ نوجوان کالج کی زندگی پر چھاگئے۔ یہ لوگ "آریہ ویکلی" کے نام سے ایک ہفتہ وار میگزین بھی نکالنے لگے۔ اس میگزین کو وہ اپنے ہاتھوں سے لکھتے تھے اور اس میں ساورکر کے ایسے مضمون بھی شامل ہوتے تھے جن سے پڑھنے والے کچھ سوچنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

ساورکر، اکثر دنیا کی تاریخ اور دنیا میں آئے بڑے بڑے انقلابوں پر تقریریں بھی کیا کرتے تھے۔ آزادی حاصل کرنے کے لیے وہ فوری جدوجہد پر بہت زور دیتے تھے۔ اب ساورکر نے اپنے ساتھیوں کی منڈلی کا نام "متر میلا" سے بدل کر "ابھی نو بھارت" رکھ دیا۔ اس مشہور سوسائٹی نے ہندوستان اور کئی باہر کے ملکوں میں اپنی شاخوں کا جال سا پھیلا دیا۔ اس سوسائٹی کے مقاصد بالکل واضح تھے۔ مثلاً "ہندوستان کو آزاد ہونا چاہیے"، "ہندوستان کو متحد ہونا چاہیے"، "ہندوستان کو ایک جمہوری حکومت ہونا چاہیے"، "ہندوستان میں ایک مشترکہ زبان اور اس کو لکھنے کا ایک مشترکہ رسم الخط ہونا چاہیے"۔ اس سلسلہ میں ساورکر کہتے تھے "کسی چیز کو مٹانے سے پہلے آپ کو یہ پتہ ہونا چاہیے کہ آپ کیا بنانے جارہے ہیں۔"

1905 میں بنگال کے دو ٹکڑے کر دیے جانے سے سارے ہندوستانیوں کے دلوں میں کڑواہٹ سی بھر گئی تھی۔ ساورکر نے ولایتی چیزوں کا بائیکاٹ کرنے کا پکا ارادہ کرلیا، لیکن اس معاملہ میں ان کا طریقہ بڑا انوکھا تھا۔ 1905 میں انھوں نے اور ان کے دوستوں نے پونا میں دسہرہ کے موقعہ پر اپنے ولایتی کپڑے جلاڈالے۔ ہندوستان میں اس قسم کا کام سب سے پہلے ان ہی لوگوں نے کیا تھا۔

ولایتی کپڑوں کو جلانے میں سب سے زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی وجہ سے ساورکر کے کالج کے پرنسپل نے ان پر دس روپیہ جرمانہ کردیا اور ان کو کالج کے ہوسٹل سے بھی نکال دیا۔ اس بات پر عوام نے بہت واویلا مچایا۔ تلک اور دوسرے تمام قومی اخباروں نے اس جرمانے کی سزا کی مذمت کی۔ ساورکر سے ہمدردی رکھنے والوں نے ڈھیر سارے پیسے ان کو بھیجے، لیکن ساورکر نے جرمانہ کی رقم خود ہی ادا کی۔

گوکھلے کی طرح نرم رویہ اپنانے والوں نے ولایتی کپڑوں کی ہولی جلانے کی نکتہ چینی کی۔ گاندھی جی اس وقت جنوبی افریقہ میں تھے۔ انھوں نے بھی اس بات کو پسند نہیں کیا لیکن اس کے باوجود اس واقعہ نے سارے ہندوستان میں انقلاب کی چنگاری کو ہوا دے دی۔

باہر کی دنیا میں

ہلچل کے اس زمانہ میں ساورکر نے بی۔ اے کا امتحان پاس کر لیا اور آگے تعلیم حاصل کرنے کے لیے بمبئی چلے گئے۔ اب تک وہ مہاراشٹر کی انقلابی تحریک کے جانے پہچانے لیڈر بن چکے تھے۔ ان کے خیالات انقلابی تھے، ان کی تقریر میں بہت جان ہوتی تھی اور اپنی تقریروں میں وہ شاعری کا بھی جگہ جگہ استعمال کرتے تھے۔ ان سب باتوں کی وجہ سے وہ عوامی جلسوں میں بہت مقبول ہو گئے تھے اور سیکڑوں نوجوان ان کی رہنمائی کے جھنڈے تلے آ گئے۔

ایک ہندوستانی پنڈت شیام جی کرشنا ورما جو لندن میں رہتے تھے، انھوں نے ساورکر کو یوروپ میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے ایک وظیفہ کی پیش کش کی۔ تلک اور پرانچپے کی سفارش پر یہ وظیفہ ساورکر کو مل گیا اور جو 1906 میں قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے وہ لندن پہنچ گئے۔ انھوں نے کہا تھا ''قانون کے مطالعہ سے حکومت کے نظام کی ان اہم باتوں کا پتہ چلتا ہے اور وہ صحیح بنیاد ملتی ہے، جہاں چوٹ پہنچا کر زیادہ فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔'' انھوں نے یہ عہد کیا تھا کہ انگریزی سرکار کی ملازمت کبھی نہیں کریں گے اور نہ ہی اس کی دی ہوئی کوئی رقم قبول کریں گے۔ ان کو یہ جاننے کا بڑا شوق تھا کہ انقلاب لانے کے لیے کس طرح کام کیا جاتا ہے۔ ان دنوں ہندوستان کے بہترین اور ذہین نوجوان تعلیم حاصل کرنے کے لیے ولایت جانے کا خواب دیکھتے رہتے تھے۔ ساورکر چاہتے تھے کہ ان کے دلوں میں ملک کی آزادی حاصل کرنے کے لیے کچھ کر گزرنے کا جذبہ بھی بیدار کر دیں۔

پنڈت شیام جی ایک عالم اور سماجی مصلح اور وطن پرست تھے۔ وہ لوکمانیہ تلک سے بہت متاثر تھے اور انھوں نے لندن میں 'انڈیا ہاؤس' قائم کیا تھا۔ ساورکر لندن میں انڈیا ہاؤس میں ہی رہے۔ لندن میں ان دنوں عدالت کی چار شاخیں (Inns of Court) ہوا کرتی تھیں۔ جلد ہی ساورکر کو ان میں سے ایک شاخ 'گرے ان' میں داخلہ مل گیا۔ ساورکر نے تعلیم

تو جاری رکھی ہی لیکن اپنا تنظیمی کام بھی جی لگا کر کرنا شروع کر دیا۔ لندن میں انھوں نے 'فری انڈیا سوسائٹی' کی بنیاد ڈالی اور 'ابھی نو بھارت' کے ممبر بنانے کے لیے نوجوانوں کی تلاش میں لگ گئے۔

ساورکر کی شخصیت اور ان کے زبردست یقین کی وجہ سے لندن میں بہت سے ممتاز ہندوستانی ،اُن کے گرد جمع ہونے لگے اور اپنی ہفتہ واری میٹنگ کرنے کے علاوہ انھوں نے ہندوستان کے تیوہار منانے اور عظیم لیڈروں کی سال گرہ منانے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ برطانیہ کو کونے کونے میں پھیلے ہوئے ہندوستانی بڑے جوش و خروش کے ساتھ ان کا ساتھ دینے لگے اور بہت سے مغربی طور طریقے چھوڑ کر سادگی کے ساتھ زندگی گزارنے لگے۔

ساورکر کے نظریات اور خیالات کو پھیلانے میں کتابوں اور پمفلٹوں کو بھی ایک بااثر ذریعہ بنایا گیا۔ انھوں نے اٹلی کے انقلابی لیڈر مازینی کی سوانح عمری کا ترجمہ مراٹھی زبان میں کیا۔ انگریزی حکومت نے اشتعال انگیز قسم کی وطن پرستی کو ہوا دینے والی اس کتاب پر پابندی لگائی لیکن اس سے پہلے ہی ہندوستان میں یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ بک چکی تھی۔

10/ مئی 1907 کو 'فری انڈیا سوسائٹی' نے 1857 کے شہیدوں کی یاد میں سلور جوبلی منائی۔ اس کے نتیجے میں ریلوں میں اور سڑکوں پر، انگریزوں اور ہندوستانیوں کے بیچ کچھ جھگڑے بھی ہوئے اور انگلینڈ کے اخباروں نے انقلابیوں کی خوب مذمت کی۔ اس کے بعد پنڈت شیام جی اپنا کام جاری رکھنے کے لیے پیرس چلے گئے اور انڈیا ہاؤس کا انتظام ساورکر کے ہاتھوں میں آ گیا۔

'فری انڈیا سوسائٹی' میں گرماگرم بحثیں ہوتی تھیں جن میں ساورکر ہندوستانیوں کو وطن کی آزادی کے لیے اپنی جانیں قربان کر دینے پر زور دیتے رہتے تھے۔

ساورکر کی کئی سیاسی کتابوں کا ترجمہ جرمن' فرانسیسی' پرتگالی' اطالوی اور روسی زبانوں میں ہوا اور اپنی قوم کے لیے کام کرنے والے ان لوگوں کو ساری دنیا کی ہمدردی حاصل ہونے لگی۔ وطن پرست سیناپتی بپت کو ساورکر کی شاندار تحریر اور تقریر، پر بڑا تعجب ہوتا تھا۔ آصف علی نے بھی اپنی ڈائری میں لکھا تھا" مجھے تعجب ہوتا ہے کہ اتنی کم عمر میں یہ شخص

تقریباً ہر اس آدمی کے دماغ پر چھا جاتا ہے جو اس کے قریب آتا ہے۔"

ہندوستانی جھنڈا

اگست ۱۹۰۷ میں جرمنی میں انٹر نیشنل سوسلسٹ کانگریس کا اجلاس ہوا۔ ہندوستان کی نمائندگی کرنے کے لیے ساورکر نے میڈم بھیکائی جی کاما اور سردار سنگھ رانا کو اسی اجلاس میں بھیجا۔ انگریزوں کی مخالفت کی پروانہ کرتے ہوئے میڈم کاما نے بڑی دلیری کے ساتھ تقریر کی اور ہندوستان کا وہ جھنڈا بھی انھوں نے وہاں لہرادیا جس کا ڈیزائن ساورکر نے بنایا تھا۔ مختلف ملکوں سے آئے ہوئے نمائندے جھنڈے کو سلامی دینے کے لیے کھڑے ہوگئے۔ جرمنی کے شہنشاہ "قیصر" کو بھی اس موقع پر یہ احساس ہوگیا کہ دنیا میں امن بنائے رکھنے کے لیے ہندوستان کو آزادی ملنا بہت ضروری ہے۔ اب دنیا نے ہندوستان کے دکھ درد کو محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔

ساورکر نے ایک جگہ بڑے جوشیلے انداز میں لکھا تھا" جو جنگ 1857 میں شروع ہوئی تھی وہ اس وقت تک نہیں رکے گی جب تک کہ انقلاب نہ آجائے، غلامی خاک میں نہ مل جائے اور تخت برطانیہ کے سامنے آزادی سر اٹھا کر نہ کھڑی ہو جائے۔ "

روس، چین، آئرلینڈ اور مصر کی انقلابی طاقتوں کے ساتھ ساورکر کا تعلق بنا ہوا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ برطانوی سامراج کے خلاف بہت سے ملک مل کر ایک متحدہ محاذ بنائیں اور تمام غلام ملکوں میں برطانوی سامراج کے خلاف ایک ساتھ بغاوت اٹھ کھڑی ہو۔ آزادی کی لڑائی لڑنے کے لیے ان کے منصوبے میں یہ باتیں بھی شامل تھیں کہ سودیشی چیزوں کے استعمال کو بڑھاوا دے کر لوگوں کے دلوں میں وطن کی محبت جگائی جائے، قومی تعلیم کو فروغ دیا جائے، ہتھیار خریدے جائیں، گوریلا جنگ کے طریقوں کا استعمال کیا جائے، ہندوستانی فوجوں کے دلوں کو جیتا جائے اور گرم لوہے پر چوٹ لگانے کے لیے صحیح وقت کا انتظار کیا جائے۔

اس وقت تک لندن میں رہنے والے ہندوستانیوں میں کافی سرگرمی پیدا ہو چکی تھی۔ وہ لوگ جوش اور اشتعال پیدا کرنے والی کتابیں اور پمفلٹ وغیرہ کافی تعداد میں چھاپ کر ڈاک اور

مختلف ذریعوں سے دور دور تک پھیلانے لگے تھے۔

1908 میں ساورکر نے اپنی یادگار کتاب "ہندوستان کی آزادی کی جنگ کی تاریخ" ہسٹری آف دی وار آف انڈین انڈی پنڈنس) مکمل کرلی لیکن ہندوستان میں کسی بھی پریس نے اس کتاب کو چھاپنے کی جرأت نہیں کی۔ حکومت نے شائع ہونے سے پہلے ہی اس کتاب کو "انقلابی، اشتعال انگیز اور باغیانہ" قرار دے کر اس پر پابندی لگادی۔ بعد میں یہ کتاب فرانس اور جرمنی سے شائع ہوئی اور اس کو پڑھ کر بھگت سنگھ اور سبھاش چندر بوس جیسے عظیم انقلابی میدان میں اترے۔

اسی سال مظفر پور میں خودی رام بوس نے پہلا بم کسی انگریز پر پھینکا۔ خودی رام مارنا تو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو چاہتے تھے لیکن وہ بچ گیا اور دو انگریز عورتیں بم کی زد میں آکر مر گئیں۔ انگریزی سرکار نے بڑی سختی کے ساتھ ہندوستانیوں کو دبانے کی کاروائیاں شروع کردیں۔ تلک کو بھی گرفتار کر کے مانڈلے بھیج دیا گیا۔ اس بات سے ہندوستان کے کونے کونے میں رہنے والے ہندوستانیوں کے دلوں کو سخت دھکا لگا۔ انگلینڈ کے اخباروں اور لوگوں نے اب اپنی ساری توجہ انڈیا ہاؤس اور ساورکر کی طرف لگادی کیوں کہ اس ساری سرگرمی کے پیچھے ساورکر کا ہی ہاتھ تھا۔

انگلینڈ کے لوگ سمجھتے تھے کہ ساورکر کوئی بڑا پرجوش اور فوراً بھڑک اُٹھنے والا آدمی ہوگا لیکن انھیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ وہ تو 25 سال کا ایک جوان تھا جو بہترین انگریزی بولتا تھا اور اس بات میں یقین رکھتا تھا کہ ہندوستان صرف ہندوستانیوں کے لیے ہے۔

گرفتاری

مدن لال ڈھینگرا لندن میں ساورکر کے سچے حامی تھے۔ انھوں نے اس بات کا عہد کیا تھا کہ ہندوستانیوں پر انگریزوں نے جو ظلم کیے ہیں ان کا بدلہ وہ لارڈ کرزن کو گولی مار کر لیں گے لیکن ان کا منصوبہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اب لارڈ کرزن کی بجائے مدن لال نے انڈیا آفس کے سرولی کو مارنے کا ارادہ کیا کیوں کہ سرولی بھی ہندوستانیوں پر ہونے والے مظالم کے لیے

برابر کا ذمہ دار تھا۔

1909 میں سرولی کے قتل سے ہر جگہ سنسنی پھیل گئی۔ سب نے ڈھینگرا کی مذمت کی اور اس کو قید بھی کر دیا گیا۔ لندن میں ہندوستانیوں نے متفقہ طور پر ڈھینگرا کی مذمت کے لیے ایک میٹنگ کی۔ جب قرار داد پاس کرنے کے لیے رائے لی جانے لگی تو مجمع میں سے ایک غصہ بھری آواز ابھری "نہیں۔ متفقہ طور پر نہیں۔ میں اس کے حق میں نہیں ہوں۔" یہ ویر ساورکر کی آواز تھی۔ ایک ہنگامہ مچ گیا اور اس ہنگامہ میں ساورکر کا چشمہ ٹوٹ گیا۔ ان کے چہرے سے خون بہنے لگا۔ لیکن بڑی بے خوفی کے ساتھ دوبارہ انھوں نے وہی بات کہی کہ وہ مدن لال کی مذمت کرنے میں باقی سب کے ساتھ نہیں ہیں۔

افراتفری میں یہ میٹنگ ختم ہو گئی لیکن ساورکر پر حملہ کرنے کی مخالفت کرتے ہوئے سریندر ناتھ بنرجی میٹنگ سے چلے گئے۔

ساورکر کے سر پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں لیکن اسی رات کو انھوں نے "لندن ٹائمز" اخبار کو ایک خط بھیجا جس میں انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ میٹنگ میں شامل ہونے والوں کو یہ حق حاصل نہیں تھا کہ وہ وقت سے پہلے، ایک عدالت کی طرح ڈھینگرا کی مذمت کریں اور یہ کہ خود ان کو یہ حق ہے کہ وہ مخالفت کریں۔ اس خط میں انھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ 'لیڈی' (سرولی کی بیوی) کے غم میں وہ دل سے شریک ہیں۔

ڈھینگرا کی اپنی خواہش پر انھیں پھانسی کی سزا دی گئی مگر اس سے پہلے ساورکر نے بہت تیزی سے ڈھینگرا کا تحریری بیان ساری دنیا میں پھیلا دیا۔ گو کہ پولیس نے اس بیان کو عوام کے سامنے آنے سے روکنے کی بھرپور کوشش بھی کی۔ ڈھینگرا نے لکھا تھا "میں اس بات کو مانتا ہوں کہ ہندوستانی نوجوانوں کو جیل میں ڈالنے اور پھانسی پر لٹکانے اور جلا وطن کر دینے کے لیے تھوڑے سے بدلے کے طور پر کل میں نے انگریز کا خون بہانے کی کوشش کی۔ ایک نہتی قوم کھلی جنگ تو لڑ نہیں سکتی اس لیے میں نے یہ اچانک حملہ کیا۔ چوں کہ مجھے بندوق رکھنے کی اجازت نہیں تھی اس لیے میں نے اپنی پستول سے گولی چلائی ...."

ہندوستان میں ساورکر کے رشتہ داروں اور دوستوں کو کافی پریشان کیا جا رہا تھا۔ انگریزی

سرکار نے ساورکر کو پریشان کرنے کا ایک نیا طریقہ نکالا۔ حالاں کہ انھوں نے 'گرے ان' سے قانون کی ڈگری لے لی تھی، لیکن انھیں قانون کی پریکٹس کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ لائسنس حاصل کرنے کے لیے یہ شرط رکھی گئی کہ وہ سیاست چھوڑ دیں لیکن ساورکر نے یہ شرط نہیں مانی۔

انڈیا ہاؤس کو بند کر دیا گیا۔ ساورکر نے بپن چندر پال کے گھر میں رہنا چھوڑ دیا کیوں کہ پولیس شکاری کتوں کی طرح ان کے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ ساورکر کے لیے یہ بڑی مایوسی کا زمانہ تھا۔ ایک نظم میں انھوں نے یہ کہہ کر اپنا دل نکال کر رکھ دیا تھا "اے سمندر! مجھے میرے وطن کے ساحل تک لے چل"

ہندوستان میں بابا راؤ ساورکر نے منٹو مارلے اصلاحات کے خلاف ایک تحریک شروع کی تھی۔ آزادی کی جنگ لڑنے کے لیے وہ اپنے ساتھ پستول اور بم بھی رکھتے تھے اور قومی جذبات سے بھرپور اپنی نظموں کو بھی استعمال کرتے تھے۔ ان ہی وجوہات کی بنا پر ان کو عمر قید کی سزا سنادی گئی۔ کنہیرے نام کے ایک نوجوان نے سزا کے اس فیصلہ کے خلاف احتجاج کیا اور ناسک کے انگریز کلکٹر مسٹر اے۔ ایم۔ ٹی جیکسن کو گولی سے اڑا دیا۔ کنہیرے کو گرفتار کر لیا گیا اور ساتھ ہی ساتھ ساورکر کے سب سے چھوٹے بھائی کو بھی وائسرائے لارڈ منٹو کے قتل کی سازش کے الزام میں دھر لیا گیا لیکن بعد میں اُسے چھوڑ دیا گیا۔

ساورکر کے لیے یہ بڑی پریشانیوں کا زمانہ تھا۔ وہ بہت اداس تھے اور ان کی صحت بھی ٹھیک نہیں چل رہی تھی۔ اپنا کام جاری رکھنے کے لیے وہ پیرس جا کر میڈم کاما کے گھر رہنے لگے۔

جب ہندوستان میں جیکسن کے قتل کا مقدمہ چلا تو ساورکر پر بھی قتل میں مدد دینے کا الزام لگایا گیا اور ان کی گرفتاری کا وارنٹ جاری ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انڈیا ہاؤس کے خاص رہنما وہی تھے۔

چناں چہ فوراً 13/ مارچ 1910 کو ساورکر کو گرفتار کر لیا گیا۔ انھیں معلوم تھا کہ ان پہ ہندوستان میں مقدمہ چلایا جائے گا اور یہ یقین تھا کہ ان کو پھانسی کی سزا دے جائے گی اس لیے برکسٹن جیل میں انھوں نے اپنی وصیت لکھی اور دل ہلا دینے والی ایک نظم میں انھوں

نے اپنے ساتھیوں کو الوداع کہا۔ موقع ملنے پر انھوں نے اپنے ایک قریبی دوست کے کان میں یہ بات کہہ دی کہ اگر حالات نے اجازت دی تو وہ مارسلیز میں ملیں گے۔ ان کے دوست ان کی بات سمجھ گئے کہ ان کو ایک کار کے ساتھ مارسلیز میں موجود رہنا ہے۔

مارسلیز میں فرار کا منصوبہ کامیاب نہ ہوسکا۔ میڈم کاما کی کار بہت دیر سے اس جگہ پہونچی۔ مارسلیز میں ساورکر نے "ایس۔ ایس۔ موریہ" جہاز سے بھاگنے کی کوشش کی تھی مگر ان کو گرفتار کر کے اسی جہاز میں بمبئی لایا گیا اور بمبئی سے خفیہ طور پر ریل کے ایک بند ڈبے میں ان کو یراودا جیل میں بھیج دیا گیا۔

مختلف الزامات کے ساتھ ساورکر پر بمبئی میں تین مقدمے چلائے گئے۔ اشتعال پیدا کرنے والی کتابیں لکھنے، حکومت کے خلاف جنگ کرنے اور دوسروں کو ہتھیار مہیا کرنے کے الزمات کی بنا پر ان کو مجرم قرار دیا گیا اور 25 سال قید کی سزا سنائی گئی۔ مسٹر جیکسن کے قتل کے سلسلہ میں ان کو 25 سال کی مزید سزا ہوئی۔ اس وقت ساورکر کی عمر صرف ۲۷ سال کی تھی۔ انڈمان کی جیلوں میں 50 سال تک قید رہنے کی اس خوفناک سزا کو انھوں نے بہادری کے ساتھ قبول کیا۔

ساری دنیا میں ہلچل مچ گئی۔ ساورکر کو ملنے والی سزا کی سخت مذمت ہوئی اور ان کو فرانس واپس بھیج دینے کا مطالبہ کیا گیا۔ ہیگ انٹر نیشنل ٹریبونل (عدالت) سے درخواست کی گئی کہ ساورکر کو کس ملک میں پناہ لینے کی اجازت دی جائے۔ حالاں کہ اس عدالت نے فیصلہ برطانیہ سرکار کی حمایت میں کیا مگر یہ ضرور کہا کہ انگریزوں کا ساورکر کو فرانس میں گرفتار کرنا ٹھیک نہیں تھا۔ ساورکر کو کسی ملک میں پناہ لینے کے حق سے محروم کردینے پر دنیا بھر کے پریس نے حکومت برطانیہ پر نکتہ چینی کی۔

ساورکر کو بھاری زنجیروں میں قید کر دیا گیا لیکن ان کے جذبہ کو کوئی قید نہیں کر سکا۔ جیل کے سفر پر روانہ ہوتے وقت جب انھوں نے اپنی بیوی کو الوداع کہا تو یہ کہہ کر تسلی دی "اگر زندگی کا مقصد بچے پیدا کرنا اور ان کی پرورش کرنا ہے۔ تو یہ کام تو چڑیاں اور کوے بھی کرتے ہیں۔ ہم نے انسانوں کی طرح زندگی گزاری ہے اور اب اپنے باورچی خانہ کی آگ اس امید

میں بجھادی ہے کہ ایک دن آئے گا جب ہزاروں گھروں کے باورچی خانوں کی چمنیوں سے سنہرا دھواں نکلے گا۔"

سرکار نے ان کی اور ان کے رشتہ داروں کی جائیدادیں ضبط کرلیں اور ان کے ذاتی سامان کو نیلام کرادیا۔ ہاں ان کا چشمہ ان کو واپس کردیا گیا اور سرکار کی نظر میں ساورکر پر یہ کافی بڑا احسان تھا۔

قیدیوں کے کئی دوسرے گروہ بھی ہتھیار بند سپاہیوں کی نگرانی میں انڈمان کی جیلوں میں بھیجے جارہے تھے۔ ان عام قاتلوں اور چوروں نے "بیرسٹر بابو" کو اپنے بیچ دیکھا تو سہم سے گئے۔ انڈمان کے دور دراز الگ تھلگ جزیروں میں اب ساورکر کو زندگی بھر رہنا تھا۔ لوہے کی ایک پلیٹ، ایک کمبل، ایک چٹائی اور ایک چھوٹا سا برتن اب ان کی زندگی کا سارا اسباب تھا۔

بمبئی سے قیدیوں کو ریل کے ذریعہ مدراس پہنچایا گیا جہاں "ایس۔ ایس۔ مہاراجہ" نام کا پانی کا جہاز ان کا انتظار کررہا تھا۔ جہاز پر سخت پہرا تھا۔

ساورکر کو جہاز کے نچلے حصے میں لوہے کے ایک پنجرے میں بند کر کے رکھا گیا تھا۔ ان کے آس پاس دوسرے بہت سے مجرم تھے۔ ان کو بہت ہی خراب کھانا دیا جاتا تھا۔ اس وقت ساورکر کے ساتھی بس اداس اور بے چین تھے۔ انھیں رہ رہ کر یہ خیال آتا تھا کہ کیا انھیں اپنا پیارا ساورکر پھر کبھی دیکھنا نصیب ہوگا؟ پانی کے جہاز کے لمبے سفر کے بعد ۴ر جولائی ۱۹۱۱ کو دور افق میں پیڑ دکھائی دینے لگے۔ ساورکر انڈمان پہنچ گئے تھے۔

جیل کی کوٹھری میں

خوفناک جیل کی تیسری منزل پر ایک چھوٹی سی بند کوٹھری اب ساورکر کا گھر تھی۔ مگر ان کے جیل پہنچنے سے جیل میں تبدیلیوں کو شروعات بھی ہوئی۔ جیلر سے خاص طور پر اجازت لے کر بہت سے لوگ اس انقلابی سے ملنے جیل میں آئے۔

انڈمان کی جیل میں زندگی قیدیوں کے لیے ناقابلِ برداشت حد تک سخت تھی اور وہاں ان سے جانوروں کی طرح بہت زیادہ محنت مشقت لی جاتی تھی۔ ساورکر کو صبح پانچ بجے اٹھادیا جاتا تھا۔

وہ لکڑی کے ایک بھاری ہتھوڑے سے پیڑ کاٹتے تھے اور یہ کام کرتے کرتے ان کے ہاتھ خون سے لہو لہان ہو جاتے تھے۔ بعد میں ان کے کندھوں پر جوا رکھ کر تیل نکالنے کا کولھو چلوایا جاتا تھا۔ اس کام میں مضبوط سے مضبوط آدمی بھی بے ہوش ہو جایا کرتے تھے۔ جو کھانا انھیں دیا جاتا تھا وہ کھانے کے لائق نہیں ہوتا تھا۔ قیدیوں کو سال بھر میں صرف ایک خط اپنے گھر بھیجنے کی اجازت تھی، لیکن کھانے کی لائن میں باتیں کرنے یا لائن سے ذرا سا باہر نکل جانے کی معمولی سی غلطی پر قیدیوں کو خط بھیجنے کے اس حق سے بھی محروم کر دیا جاتا تھا۔

بہت سے قیدی تو عاجز آکر خودکشی بھی کر چکے تھے۔ لیکن ساورکر نے اپنے کو چپ چاپ جیل کی زندگی کے مطابق ڈھال لیا اور وہ خود اپنے اندر سمٹ کر رہ گئے۔ انھوں نے جیل کی زندگی کے بارے میں لکھا تھا "میرے ہاتھ پاؤں تو مشین کی طرح اپنے آپ کام کرتے رہتے ہیں لیکن میری روح اور میرے خیالات سب سے بچتے بچاتے سمندر کے کنارے کی فرحت بخش فضا میں مگن ہوتے ہیں۔"

بابو راؤ ساورکر بھی اسی جیل کی ایک دوسری کوٹھری میں قید تھے۔ وہاں وہ بہت زیادہ بیمار ہو گئے۔ کافی عرصے تک ساورکر اپنے پیارے بھائی کو دیکھ بھی نہیں پائے۔ لیکن بعد میں دونوں بھائی خفیہ طور پر کبھی کبھی ایک دوسرے کو پیغام بھیج دیتے تھے۔ بابو راؤ کو اس بات کا افسوس تھا کہ دنائک ساورکر کی بہترین دماغی صلاحیتیں جیل میں رہ کر برباد ہو رہی تھیں۔ اس پر ایک بار ونائک ساورکر نے ان الفاظ میں اپنے بھائی کو تسلی دی تھی "آخری فتح حاصل کرنے کے لیے یہ آہیں، یہ دکھ اور قربانیاں اتنی ہی ضروری ہیں جتنا کہ فتح کے بینڈ بجاتے ہوئے جنگ لڑنا ضروری ہوتا ہے"۔ وہ جیل کے دوسرے قیدیوں کے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے کہا کرتے تھے کہ ان کی تکلیفیں بے کار نہیں ہیں بلکہ ایک عظیم مقصد حاصل کرنے کے لیے ہیں۔

دوسری طرف ساری دنیا میں ویر ساورکر کی بہادری کی تعریف ہو رہی تھی۔ انگریزی سرکار نے اس بہادر نوجوان کو جو سخت سزا دی تھی، روس کے عظیم مصنف میکسم گورکی نے اس کی سخت مذمت کی تھی۔ لالہ لاجپت رائے نے "ینگ انڈیا" میں لکھا تھا کہ "ساورکر میں رہنمائی کرنے کی بہت عمدہ خصوصیات موجود تھیں۔ ان کو اس لیے سزا ملی کیوں کہ وہ ایک نڈر انسان

تھے۔ انھوں نے اپنی جان کی حفاظت کی فکر کبھی کی ہی نہیں۔ ان میں ایک پرانے تجربہ کار سپاہی کی پُر جوش روح تھی جو خود آگے بڑھ کر اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال دیتا ہے۔"

مصلح

ذرا سوچیے' ساورکر کے پاس لکھنے کے لیے نہ کاغذ تھا نہ قلم، مگر ان کے خیالات اور جذبات تھے کہ امڈے پڑتے تھے۔ وطن کی سچی محبت سے بھرپور عظیم نظمیں اور بہت سے عمدہ خیالات وہ اپنے ذہن کی تختی پر لکھتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی وہ اپنی جیل کی کوٹھری کی دیواروں پر کسی پتھر کے ٹکڑے یا کسی کانٹے کی مدد سے بھی اپنی نظمیں وغیرہ لکھ لیا کرتے تھے۔

ایک دفعہ انھیں پتہ چلا کہ ایک کم عمر ہندو قیدی اپنا مذہب بدلنے والا ہے۔ انھوں نے اس معاملہ میں جیل کے افسران کے ساتھ سنجیدگی سے بات کی اور کہا کہ کسی بھی قیدی کو زور زبردستی یا دھوکے سے اپنا مذہب بدلنے کے لیے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ تمام کم عمر بچوں کو اسی مذہب کی تعلیم ملنی چاہیے جس کو ان کے ماں باپ مانتے ہیں اور جب وہ اپنے معاملات خود طے کرنے لائق ہو جائیں تو مذہب کا معاملہ ان پر چھوڑ دینا چاہیے۔ جیل کے سپرنٹنڈنٹ کو ساورکر کی یہ بات صحیح لگی اور اس لڑکے کی تبدیلی مذہب کے معاملہ کو روک دیا گیا۔ جیل کے دوسرے ہندو قیدی اس نیچ ذات کے لڑکے کو اپنے ساتھ کھانا نہیں کھانے دیتے تھے۔ ساورکر اس لڑکے کو اپنے پاس بٹھا کر کھانا کھلاتے تھے۔ اس بات کو لے کر دوسرے قیدی ان کو "بھنگی بابو" کہہ کر اپنی نفرت کا اظہار کرتے تھے۔

ساورکر اچھی طرح سمجھتے تھے کہ کٹر پن کو بدلنے کے لیے بہت صبر سے کام لینا چاہیے۔ انھوں نے ہندوؤں کو سمجھایا کہ کسی کے صرف چھو دینے سے کھانا ناپاک ہو جانے کی بات محض ایک مذاق ہے۔ وہ اکثر ذات پات کے نظام کو ایک لعنت کہا کرتے تھے۔

ساورکر کی باتیں سن سن کر بہت سے قیدیوں نے دوبارہ ہندو مذہب اپنا لیا اور پھر سے ہندو نام رکھ لیے۔ ساورکر ہر اس شخص کو ہندو مانتے تھے "جو دریائے سندھ سے لے کر سمندر تک پھیلے ہوئے بھارت ورش کی سرزمین کو اپنا مقدس وطن سمجھتا ہے۔"

ساورکر قیدیوں کو حقوق اور آسانیاں دلانے کے لیے افسران سے لڑتے رہتے تھے اور اس معاملہ میں مذہب کے فرق کا کوئی خیال نہیں کرتے تھے۔ بہت سے نوجوان سیاسی قیدی انقلابی جدوجہد کے اصولوں سے ناواقف تھے۔ کام کرتے ہوئے جب تھوڑا سا موقع ملتا تھا تو ساورکر ایسے نوجوان قیدیوں کو سیاسیات، معاشیات اور دستوری قانون کے بارے میں باتیں بتایا کرتے تھے۔ کبھی کبھی خفیہ طریقے پر کاغذ کے پرزوں پر لکھ کر بھی وہ ان کو اس قسم کی باتیں سکھایا کرتے تھے۔

انھوں نے جیل کے افسر سے اس بات کی اجازت لے لی کہ ہر قیدی کے گھر والے کچھ کتابوں کی پارسل اس کو بھیج دیں اور ان کتابوں کو اکٹھا کر کے قیدیوں کے لیے ایک لائبریری بنائی جائے۔ وہ ان پڑھ قیدیوں کو، جی جان سے لکھنا پڑھنا بھی سکھایا کرتے تھے۔ وہ اسی وقت سے اس بات پر بھی زور دیتے تھے کہ وہ ہندی پڑھیں کیوں کہ ہندی کو آگے چل کر ہندوستان کی قومی زبان بننا تھا۔

جب 1914 میں پہلی جنگ عظیم چھڑی تو ساورکر نے اس بات سے خوش ہوئے کہ ہندوستان بھی اس میں حصہ لے رہا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستانی سپاہیوں کو دنیا کے بہترین سپاہیوں کا مقابلہ کرنے سے بہت اچھا تجربہ حاصل ہوگا۔

یوروپ اور امریکہ میں رہنے والے انقلابیوں نے ایک منصوبہ بنایا کہ بنگال میں ہتھیار سپلائی کیے جائیں اور وہاں سے، پورٹ بلیئر پر حملہ کر کے ساورکر اور دوسرے قیدیوں کو آزاد کرا لیا جائے۔ ایک جرمن پن ڈبی ہندوستان کے انقلابیوں کو لے کر خلیج بنگال میں آ بھی گئی اور اس نے بندرگاہوں اور مال لے جانے والے برطانوی جہازوں پر حملے بھی کیے لیکن انگریزوں نے اس کو تباہ کر دیا۔ بہت سے لوگوں کو جیلوں میں بند کر کے اور بہتوں کو پھانسی پر چڑھا کر انگریزوں نے اس بغاوت کو بے رحمی کے ساتھ کچل دیا۔ اس واقعہ سے چوکنا ہو کر ساورکر کو سنٹرل جیل کی عمارت کے مینار میں منتقل کر دیا گیا اور ان پر پہرہ اور کڑا کر دیا گیا۔

ایک کے بعد ایک جیل کے لمبے سال گزرتے رہے۔ جنگ کے خاتمے پر تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کرانے کے لیے ہر جگہ ہنگامے ہونے لگے۔ بہت سے قیدیوں کو رہا بھی کر دیا گیا لیکن

ساورکر بھائیوں کو ملک کی امن و حفاظت کے لیے خطرہ سمجھا گیا اور جیل میں ان سے اور بھی زیادہ سخت مشقت لی جانے لگی۔ ساورکر کی صحت بہت خراب ہو گئی اور اپنے صحت مند زمانہ کی بس ایک دھندلی سی تصویر بن کر رہ گئے۔

1920 میں وٹھل بھائی پٹیل نے مرکزی لیجسلیٹو اسمبلی میں ساورکر بھائیوں کی آزادی کے لیے مانگ رکھی۔ تلک نے بھی ہندوستان کے سکریٹری آف اسٹیٹ مسٹر مانٹیگو سے یہی مانگ کی۔ گاندھی جی نے اپنے اخبار "ینگ انڈیا" میں ساورکر بھائیوں کی آزادی کے لیے ایک اپیل شائع کی اور کہا کہ چوں کہ ان کے خلاف کوئی جرم ثابت نہیں ہو سکا ہے، اس لیے ان کو رہا کیا جانا چاہیے۔ اسی زمانہ میں انڈمان کی جیلوں کی ابتر حالت کے بارے میں ساورکر کے کچھ خط بھی شائع ہوئے۔

آخرکار ساورکر بھائیوں کو 2/ مئی 1921 کو ہندوستان واپس لایا گیا۔ ایس۔ ایس مور یہ کا وہی جہاز انھیں واپس لیا جوان کو کبھی انڈمان لے گیا تھا۔

مجاہد

اب ساورکر کو رتنا گری کی جیل میں رکھا گیا۔ وہاں انھوں نے اپنی کتاب "ہندوتو" لکھی اور اپنے اصلی نام کے بجائے اس پر مصنف کا نام "مرہٹہ" لکھا۔ مکمل ہو جانے پر چوری چھپے کتاب جیل سے باہر بھیج دی گئی۔ اس کے بعد انھیں یراودا جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ محنت مشقت کا سخت کام کرنے کے باوجود، وہ ان پڑھ قیدیوں کو تعلیم دینے اور جیل کی لائبریری کو بڑھانے کا کام بھی کرتے رہتے تھے۔

1923 میں کاکی ناڈا میں انڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس ہوا جس میں ایک ریزولیشن پاس کر کے ساورکر کی فوری رہائی کی مانگ کی گئی۔ آخرکار 6/ جنوری 1924 کو ساورکر کو رہا کر دیا گیا لیکن ساتھ ہی ساتھ دو شرطیں بھی رکھی گئیں۔ پہلی شرط یہ تھی کہ وہ صرف رتنا گری ضلع میں رہیں گے اور دوسری یہ کہ پانچ سال تک کسی سیاسی سرگرمی میں حصہ نہیں لیں گے۔ حکومت نے یہ اختیار اپنے پاس رکھا کہ ان شرطوں کی مدت دوبارہ بڑھائی جا سکتی ہے۔

ساورکر تیرہ سال سے ہندوستان کے سیاسی منظر میں شامل نہیں رہے تھے اور ان تیرہ برسوں میں ہندوستانی سیاست میں بہت تبدیلی آچکی تھی۔ نرم رویہ رکھنے والے رہنماؤں میں سے اب کوئی باقی نہیں بچا تھا۔ مسلم لیگ مسلمانوں کے لیے علیحدہ نمائندگی اور علیحدہ سے انتخابی حلقے بنانے کی مانگ کر رہی تھی۔

ساورکر پر پابندی لگادی گئی تھی کہ وہ سیاسی معاملات میں شامل نہ ہوں لیکن سماج سدھار کا کام تو وہ کر ہی سکتے تھے۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد 23 /جنوری 1924 کو انھوں نے ''رتنا گری ہندو سبھا'' کی بنیاد ڈال دی تھی۔ ہندوستان کے قدیم کلچر کی حفاظت اور سماج کی بھلائی کے لیے کام کرنا اس سبھا کا مقصد تھا۔

اس بات کا خطرہ تھا کہ اس غیر سیاسی تنظیم کی وجہ سے فرقہ وارانہ جذبات بھڑک اٹھیں گے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ''رتناگری سبھا'' نے اقلیتوں کی حفاظت کا پورا خیال رکھا اور ہر قسم کے ظلم اور ناانصافی کی مخالفت کرنے کو اپنا مقصد بنایا۔ ہندو تیوہاروں کے موقع پر ہر سال ساورکر مسلمانوں اور عیسائیوں کے گھر جاکر ان سے ملتے تھے تاکہ آپس میں محبت اور میل جول بڑھے۔

ساورکر کی یہ دلی خواہش تھی کہ ہندوستان میں ایک ایسا ہندو سماج بنے جس میں ذات پات کا کوئی فرق نہ ہو اور پھر قومی اکثریت کی حیثیت سے یہ سب مل کر مکمل آزادی حاصل کرنا اپنا مقصد بنائیں۔ لیکن سب سے پہلے تو ہندو کٹرپن کے خلاف لڑائی لڑنا تھا۔ ایک بار جب ساورکر نے ایک ''اچھوت'' کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا تو سارے ہندو ہکا بکا رہ گئے۔ حالاں کہ اس بات کی زبردست مخالفت کی جاتی تھی لیکن ساورکر اکثر ایسی دعوتوں کا انتظام کرتے رہتے تھے، جس میں مختلف ذاتوں کے لوگ شامل ہوتے تھے۔ اعتراض کرنے والوں کا منہ وہ ''مہابھارت'' کا یہ واقعہ سناکر بند کردیتے تھے کہ کرشن جی نے بھی ایک نوکرانی کے لڑکے ودورا کے ساتھ کھانا کھایا تھا۔ ان کی تعلیم تھی ''کسی کے ساتھ بیٹھ کر کھالو۔ کوئی بھی ایسی چیز کھالو جو صحت کے لیے نقصان دہ نہ ہو۔ اس سے تمہارے مذہب پر کوئی چوٹ نہیں پڑے گی۔ چھوا چھوت تو انسانیت کے دامن پر ایک دھبہ ہے۔''

وہ اچھوتوں سے کہتے تھے کہ وہ اس طرح جئیں کہ ان کی عزت برقرار رہے۔ ساورکر خود ان کے گندے جھونپڑوں میں جا جا کر ان کو صحت و صفائی کے بارے میں باتیں بتایا کرتے تھے۔ اونچی ذاتوں کے ہندوؤں کو وہ سمجھایا کرتے تھے کہ کوئی بھی کام ایسا نہیں ہے جس کے کرنے سے ان کی عزت پر آنچ آتی ہو۔ انسان کی حیثیت تو اس کی قابلیت اور صلاحیت سے بنتی ہے۔ انھوں نے ایسے اسکول بھی کھولے جہاں اونچی ذات کے لڑکوں کے ساتھ نیچ ذاتوں کے بچے بھی پڑھتے تھے۔

جن لوگوں نے اپنا مذہب تبدیل کر لیا تھا ان کو واپس ان کے مذہب میں لایا گیا۔ مختلف ذاتوں کے لوگوں کے درمیان شادیاں ہوئیں اور مندروں کے دروازے نیچی سے نیچی ذات کے لوگوں کے لیے کھول دیے گئے۔ تیوہاروں کے موقع پر سبھی ذاتوں کے لوگ مل کر خوشیاں مناتے تھے اور نیچی ذات والے لوگ پجاریوں کا کام کرتے تھے اور لوگوں کو دھرم کرم کی باتیں سمجھاتے تھے۔

ڈاکٹر امبیڈکر، اچھوتوں کی آزادی کے لیے جو جدوجہد کر رہے تھے اس میں ساورکر نے ان کا پورا پورا ساتھ دیا۔ اب ساورکر کی ان کوششوں کی تعریف کی جانے لگی اور سماج میں تبدیلی کے آثار دکھائی دینے لگے۔

ہر کام میں مادری زبان استعمال کرنے کے لیے انھوں نے لوگوں سے اپیل کی اور ہندی کی ترقی اور اُسے دوسری زبانوں سے پاک کرنے کے لیے ایک زبردست تحریک بھی چلائی۔ انھوں نے دیوناگری رسم الخط میں اصلاح کرنے کی کچھ ایسی تجویزیں پیش کیں جن سے دیوناگری کی چھپائی میں آسانی ہو سکتی تھی۔

رتناگری میں ساورکر سے ملنے کے لیے بہت لوگ آتے رہتے تھے۔ ان سے شروع شروع میں ملاقات کرنے والے ڈاکٹر ہیج ور بھی تھے جنھوں نے راشٹریہ سویم سیوک سنگھ (آر۔ایس۔ایس) کی بنیاد ڈالی تھی۔ انھوں نے ساورکر سے مل کر آر۔ایس۔ایس کے مستقبل کے بارے میں بات چیت کی تھی۔ 1927 میں گاندھی جی بھی رتناگری پہنچے۔ ساورکر نے 'عدم تعاون' اور 'خلافت' کی تحریکوں کے ناکام ہو جانے پر سخت نکتہ چینی کی تھی

کیوں کہ ان کے نتیجہ میں ہندوستانیوں پر بہت ظلم کیے گئے تھے۔ گاندھی جی اور ساورکر کے خیالات میں فرق ہونے کے باوجود ان دونوں کی دوستی میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ ساورکر ان دنوں بیمار چل رہے تھے لیکن انھوں نے گاندھی جی اور کستوربا کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ دونوں نے تبدیلی مذہب کے مسئلہ پر بات چیت کی اور دونوں اس بات پر متفق ہو گئے کہ ہر انسان کو اپنی پسند کا مذہب اختیار کرنے کی آزادی ہونی چاہیے۔

ساورکر جدید سائنس کو بہت پسند کرتے تھے۔ انھوں نے ایک بار کہا تھا "مشینیں انسان کے لیے ایک نعمت ہیں کیوں کہ مشینوں کے استعمال سے انسان اس قابل ہوا ہے کہ دور دور تک سفر کر سکے، دور تک دیکھ سکے، اور دور دراز کے علاقوں میں رہنے والوں سے بات چیت کر سکے۔" وہ غلط اعتقادات اور آنکھیں بند کر کے ہر بات کو مان لینے کی مخالفت کرتے تھے اور ترقی کرنے کے لیے عقل سے کام لینے کو ضروری سمجھتے تھے۔

رتناگری میں رہتے ہوئے ویر ساورکر کو 'ہندو پد پادشاہی' اور "میری عمر قید' نامی کتابیں لکھنے کا وقت ملا۔ ان کتابوں کے علاوہ اس زمانہ میں انھوں نے بہت سی نظموں کے مجموعے، ڈرامے اور ناول بھی تصنیف کیے۔

انگریزی سرکار نے ساورکر کو تنبیہ کی کہ اگر انھوں نے ان پر لگائی گئی شرطوں کو توڑا تو ان کی سزا کے باقی 37 سالوں کے لیے ان کو پھر سے جیل بھیجا جا سکتا ہے۔ جب کبھی بھی کوئی گڑبڑ ہوتی تو پولس ان کے مکان پر چھاپہ مارتی تھی۔ پولس کو ان کی کتاب "ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ" کی بھی تلاش تھی۔ اس کتاب پر سرکار نے پابندی لگائی ہوئی تھی لیکن پابندی کی باوجود بھگت سنگھ نے اس کتاب کی دو ہزار جلدیں شائع کرائی تھیں۔ ان کتابوں کی فروخت سے ہونے والی آمدنی سے وہ اپنی انقلابی سوسائٹی کا خرچ چلاتے تھے۔

1934 میں ساورکر کو بمبئی میں گولی چلائے جانے کے شبے میں گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن جلدی ہی رہا کر دیا گیا۔ حکومت کو اس بات کا خطرہ تھا کہ ساورکر کے دل میں بغاوت کی آگ اب بھی کافی حد تک بھڑک رہی ہے اس لیے انھوں نے ان پر لگائی گئی پابندیوں کی مدت ۱۹۳۷ تک بڑھا دی۔

قوم پرستی

آخر کا ساورکر پر لگائی گئی پابندیوں کی مدت ختم ہوگئی اور وہ سیاسی زندگی میں حصہ لینے کے لیے آزاد ہوگئے۔ اب سب سے پہلے ساورکر نے ملک بھر کا طوفانی دورہ کیا۔ وہ تلک کی ''سوراج پارٹی'' میں شامل ہوگئے۔ اس کے بعد انھوں نے ''ہندو مہا سبھا'' کو ایک علیحدہ سیاسی پارٹی بنایا اور اس کی تنظیم میں لگ گئے۔

ساورکر کی نظر وقت کی کھڑکی سے دور تک دیکھ رہی تھی۔ وہ مسلم لیگ کے مقاصد کو اچھی طرح سمجھتے تھے اور ان کو اس بات کا خطرہ تھا کہ ملک کے ٹکڑے ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ جب گاندھی جی نے کشمیر کے مہاراجہ کو مسلم اکثریت کے حق میں تخت سے دستبردار ہو جانے کا مشورہ دیا تو ساورکر نے اس کی مخالفت کی۔

1937 میں ویر ساورکر کو اتفاق رائے سے ہندو مہا سبھا کا صدر چن لیا گیا۔ انھوں نے ملک کے بہت سے حصوں کا سفر کیا اور ہر جگہ عوام بھاری تعداد میں ان کے جلسوں میں شامل ہوئے۔ ساورکر کی مضبوط دلیلوں اور عمل کے پیغام سے لوگوں میں بہت جوش پیدا ہو گیا تھا۔

ساورکر نے ہندو فلسفہ کو سیاست اور اصلاح کے ساتھ جوڑ دیا تھا۔ ان کے خیالات کو 'ہندو سنگھٹن کا نظریہ' کہا جاتا تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ جین، بدھ اور سکھ سبھی ویدک فلسفہ کو مانتے ہیں اس لیے سبھی ہندو ہیں اور ذات، مذہب اور زبان کے مشترکہ دھاگے سے آپس میں بندھے ہوئے ہیں۔ وہ اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے تو حامی تھے لیکن یہ ماننے کو تیار نہیں تھے کہ ہندوستان پر اقلیتوں کا غلبہ ہو جائے یا ہندوستان کے ٹکڑے ہو جائیں۔

انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ وقت کی سب سے بڑی ضرورت سپاہی ہیں اور سارے ملک میں فوجی تربیت دینے کا پروپیگنڈہ تیز کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ایک قومی فوج تیار ہو جائے تو وہ ایک دن انگریزی غلامی کا جوا ملک کے کندھوں سے اتار کر پھینک سکتی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر کسی قوم کے پاس ہتھیار نہ ہوں اور وہ اپنی حفاظت کے لیے تیار نہ ہو تو اس کی آزادی ایک دن بھی قائم نہیں رہ سکتی۔ دوسری بات جس پر وہ زور دیتے تھے وہ یہ تھی کہ ملک کی صنعت و

حرفت میں خوب ترقی ہونی چاہیے۔

'ہندو سنگٹھن' نے شہری حقوق کے لیے احتجاج کرنے کے لیے بہت سے مرکز قائم کر دیے۔ حیدر آباد میں جب سنگٹھن کے والنٹیر نے انتظام کی خرابی اور سرکار میں ہندوؤں کی نمائندگی نہ ہونے کی بات کو لے کر احتجاج کیا تو سرکار نے 15000 لوگوں کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا لیکن حیدر آباد کے نظام نے سدھار کا اعلان کیا۔ ملک میں 'مہا سبھا' کی مقبولیت تیزی سے بڑھ رہی تھی لیکن کانگریس نے اپنے کو 'مہا سبھا' سے الگ رکھا۔ اس دوران محمد علی جناح نے اپنی پوزیشن کافی مضبوط بنالی تھی۔

پہلی ستمبر 1939 کو برطانیہ نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ہندوستان کے وائسرائے نے اعلان کیا کہ ہندوستان بھی جرمنی کے خلاف اس جنگ میں شامل ہے اور وہ بھی انسانی آزادی کے لیے لڑائی لڑے گا۔

ہندو مہا سبھا کے صدر کی حیثیت سے ساورکر نے کہا کہ جب تک خود برطانیہ ہندوستان پر قابض ہے انسانی آزادی کے حق کی حفاظت کی بات کرنا اس کے لیے بالکل بے معنی ہے۔ پھر بھی چوں کہ ملک کے سامنے سیاسی اعتبار سے غیر معمولی حالات (ایمرجنسی) تھے۔ اس لیے ساورکر فوجی معاملات میں ہندوستان کی انگریزی سرکار کو تعاون دینے کے لیے تیار ہوگئے۔ انھوں نے یہ تجویز رکھی کہ شمال مغربی سرحدوں پر گورکھا اور سکھ فوجیں بھیجی جائیں۔ مشرقی سرحدیں بھی محفوظ نہیں تھیں۔ ایسے حالات میں ساورکر نے لازمی ملٹری ٹریننگ پر زور دیا اور ساتھ ہی ساتھ ہندوستان کو ایک ڈومینین کا درجہ دینے کی مانگ بھی کی۔ ان کے خیال سے مکمل آزادی کی طرف یہ پہلا قدم ہوتا۔

ساورکر آنے والے حالات کو دیکھ رہے تھے۔ اس بات سے وائسرائے کافی متاثر ہوئے۔ وائسرائے نے کچھ عرصہ بعد اپنی یہ رائے ظاہر کی تھی کہ شاید ساورکر ہی ایک ایسے سیاستداں تھے جو ہندوستان کے نقطہ نظر سے جنگ کے بارے میں بات چیت کر سکتے تھے۔

1939 میں کلکتہ میں جب ہندو مہا سبھا کا اجلاس ہوا تو اس میں دو لاکھ آدمی شریک ہوئے۔ ساورکر کا زبردست استقبال ہوا اور بنگال سے شائع ہونے والے اخبار 'امرت بازار پتریکا' نے

ان کو ایک 'عظیم مقصد رکھنے والا انسان' کہا۔

بڑے بڑے جلسوں میں انھوں لوگوں میں بیداری پیدا کرنے کے لیے لگاتار تقریریں کیں۔ بہت سے لوگ ان کی باتوں سے متاثر ہوئے۔ متاثر ہونے والے ان لوگوں میں سبھاش چندر بوس بھی شامل تھے۔ 1940 میں نیتاجی سبھاش چندر بوس اچانک غائب ہوگئے تھے۔ اس واقعہ سے چھ مہینے پہلے وہ بمبئی میں ساورکر کے گھر جا کر ان سے ملے تھے۔

ہندوستان کے اتحاد میں یقین

ساورکر نے ہندوستان کی آزادی اور اتحاد کے مقصد کو سامنے رکھ کر جدوجہد کی تھی۔ جہاں تک آزادی کا سوال ہے، اس کے ملنے کے تو آثار نظر آنے لگے تھے۔ لیکن ملک کے اتحاد کے سلسلہ میں ساورکر کو کئی خطرے نظر آرہے تھے۔ کانگریس کی پالیسیوں سے ان کو اتفاق نہیں تھا۔

1940 میں مسلم لیگ نے ایک علیحدہ ملک کی مانگ رکھی۔ اس ملک میں وہ علاقے شامل ہونے تھے جن میں آبادی کے لحاظ سے مسلمان اکثریت میں تھے۔

1941 میں جو مردم شماری ہونے والی تھی اسی کی بنیاد پر تمام دستوری معاملات طے ہونے تھے۔ ایسی صورت میں ساورکر کی سمجھ میں یہ بات کبھی نہیں آئی کہ کانگریس نے 1941 کی مردم شماری کا بائیکاٹ کیوں کیا تھا۔ کانگریس نے 1921 اور 1931 میں ہونے والی مردم شماری کا بھی بائیکاٹ کیا تھا مگر اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ مردم شماری کے اعداد و شمار صحیح طور پر حاصل نہیں ہو سکے تھے۔ ۱۹۴۱ کی مردم شماری کے موقع پر ساورکر نے جینیوں، سکھوں اور آریہ سماجیوں سے اپیل کی کہ وہ مردم شماری میں اپنا مذہب ہندو لکھوائیں۔

ایک غیر پارٹی کانفرنس میں ساورکر نے ہندوستانیوں سے اپیل کی کہ حالاں کہ وہ مختلف مذہبوں کو مانتے ہیں، لیکن ایک مشترکہ مقصد یعنی آزادی حاصل کرنے کے لیے ان کو کندھے سے کندھا ملا کر چلنا چاہیے۔ ایسا لگا کہ ساورکر کی معقول دلیلوں سے سبھی مطمئن ہیں۔ اس کانفرنس میں ہندوستان کے لیے ایک عارضی قومی حکومت کی مانگ بھی رکھی گئی۔

جناح نے پہلے کی طرح اب بھی ہندو مہا سبھا کی مذمت کی اور اعلان کیا کہ کچھ آزاد پاکستانی ریاستوں کا بننا لازمی ہے۔

ساورکر نے اس بات کے جواب میں یہ کہا تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے امن اور خوشحالی کے ساتھ رہنے کا ایک ہی راستہ تھا اور وہ یہ کہ ہندوستانی قوم کی آزادی اور سالمیت کے اصولوں کی بنیاد پر مسلمان ہندوستانی قوم کا ایک حصہ بن کر رہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ ملک کے تمام شہریوں کو آبادی کے تناسب سے نمائندگی حاصل ہو۔ ان کی قابلیت کے مطابق سرکاری نوکریاں ملیں، اپنے مذہب کے مطابق عبادت کرنے کی آزادی ہو اور زبان وغیرہ کے معاملہ میں بنیادی حقوق حاصل ہوں، اور اس معاملہ میں کسی کے ساتھ کوئی امتیاز نہ برتا جائے۔

1941 میں بھاگل پور میں ہونے والے ہندو مہا سبھا کے اجلاس پر پابندی لگادی گئی۔ ساورکر نے شہری حقوق کے لیے جدوجہد کرنے کی آواز اٹھائی تو زبردست مظاہرے ہوئے اور ہزاروں آدمیوں کے ساتھ ساورکو بھی گرفتار کرلیا گیا۔

دوسری جنگ عظیم جاری تھی۔ سنگاپور میں انگریزوں کی ہار ہوئی اور جنوب مشرق میں کئی جگہوں پر ان کی فوجوں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ اس موقع پر ساورکر نے انگلینڈ کے وزیراعظم ونسٹن چرچل کو تار کے ذریعہ یہ پیغام بھیجا کہ اگر ہندوستان کو آزادی دینے کا اعلان کردیا جائے تو برطانیہ کی طرف سے لڑنے کے لیے انگریزی فوجوں کو ہندوستانیوں سے بہت مدد مل سکتی ہے۔

اس تار کے وصول ہونے کی اطلاع شکریہ کے ساتھ دی گئی۔ چار دن بعد ہی چرچل نے کرپس مشن بھیجنے کا اعلان کیا۔ اس مشن کی بنیاد ہندوستان کو 'ڈومی نین' کا درجہ دینا، اور صوبوں کو اپنی حکومتیں بنانے کی پیش کش پر رکھی گئی تھی۔ یہ 1942 کا مارچ کا مہینہ تھا۔

ساورکر نے سر اسٹیفورڈ کرپس سے بات چیت کے دوران پیش کش کے پہلے حصہ کو تو مان گیا لیکن دوسرے حصہ کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا کیوں کہ اس دوسرے حصہ میں پاکستان بنانے کی بات تقریباً مان لی گئی تھی۔ اس موقع پر انھوں نے کہا تھا "ہندوستان کلچر اور قومیت کے لحاظ سے ایک ایسی اکائی ہے جس کو تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔"

کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے ایک ریزولیشن میں کہا کہ 'کسی علاقہ میں رہنے والوں کو ان کی مرضی کے خلاف انڈین یونین میں شامل ہونے کے لیے مجبور کرنے کی بات وہ سوچ بھی نہیں سکتے۔' ساورکر کو کانگریس کے اس رویہّ سے بڑی مایوسی ہوئی۔ اب ایسا لگنے لگا تھا کہ ملک کی تقسیم کا حادثہ ہونا لازمی ہے اور ساورکر کے لیے یہ بڑے دکھ کی بات تھی۔

اس زمانہ میں ہندو مہا سبھا ایک ایسی طاقت بن چکی تھی جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بہت سے شہروں اور ضلعوں میں ہونے والے الکشنوں میں ہندو مہا سبھا نے بہت سی سیٹیں حاصل کرلی تھیں۔

ہندوستان چھوڑو تحریک

جب گاندھی جی نے 'ہندوستان چھوڑو تحریک' چلائی تو ساورکر نے اعلان کیا کہ اگر کانگریس ملک کے اتحاد اور سالمیت کی پالیسی کو مانے اور مسلم لیگ سے کوئی معاہدہ نہ کرے تو ہندو مہا سبھا اس تحریک میں کانگریس کا ساتھ دے گی۔ بی۔بی۔سی۔ ریڈیو سے تقریر کرتے ہوئے انھوں نے بڑی زوردار آواز میں کہا تھا "ہندوستان چھوڑو کی یہ تحریک 'ہندوستان بانٹو' کی تحریک نہیں بنی چاہیے۔"

ملک بھر میں ہلچل مچ گئی اور بہت بڑی تعداد میں لوگوں کو گرفتار کیا جانے لگا۔ مسلم لیگ نے اس موقع پر الگ تھلگ رہ کر صورت حال سے فائدہ اٹھایا۔

گاندھی جی جب آغا خاں پیلیس میں نظر بند تھے تو انھوں نے اپنا اکیس دن کا برت شروع کردیا۔ ساورکر نے ان کی رہائی کے لیے اصرار کرتے ہوئے کہا "ہمیں گاندھی جی سے درخواست کرنی چاہیے کہ وہ اپنا برت توڑ دیں۔ ان کی زندگی صرف ان کی اپنی زندگی نہیں ہے بلکہ اس سے زیادہ ان کی زندگی قوم کی امانت ہے، قوم کا سرمایہ ہے۔"

ساورکر نے چرچل کو ایک اپیل بھیجی جس میں کہا گیا تھا کہ ہندوستان کے ٹکڑے کیے بغیر ہندوستان کو آزادی ملنی چاہیے۔ اس اپیل پر مسلمانوں اور سکھوں کے ممتاز رہنماؤں اور کرسچین فیڈریشن کے ذمہ دار لوگوں کے بھی دستخط تھے۔ مسلم لیگ ان سب باتوں سے بے

تعلق رہی۔ ذاتی طور پر برطانیہ کے وزیر اعظم نے ساورکر کی اتحاد کی زبردست کوشش کی تعریف کی لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا کہ اب ایسا کرنا ممکن نہیں ہے کیوں کہ ہندوستان کی تمام بڑی سیاسی پارٹیاں اس کی حمایت میں نہیں ہیں۔

ساورکر کی ساٹھیوں سال گرہ بڑے جوش و خروش کے ساتھ منائی گئی۔ ان کی عظیم ادبی خدمات کے لیے ناگپور یونی ورسٹی نے ان کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی دی۔

صوبوں میں ہندو مہا سبھا اور مسلمانوں کو ملا کر ملی جلی سرکاریں بنانے کی امید پیدا ہو گئی تھی۔ ساورکر نے جناح سے بات کر کے ان کو اس بات کے لیے آمادہ کر لیا کہ آبادی کی بنیاد پر ملی جلی سرکاریں بنائی جائیں۔ شرط صرف یہ ہوگی کہ اس سے ہندوستان کے اتحاد پر کوئی برا اثر نہ پڑے، لیکن اس تجویز پر عمل نہیں ہو سکا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ تجویزوں کو عمل میں لانے کے معاملہ میں دیر ہو گئی تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ جناح پر کسی نے حملہ کر دیا تھا۔ ساورکر نے مسٹر جناح پر اس حملہ کی مذمت کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس قسم کی حرکت "عوامی اور شہری زندگی پر ایک دھبہ" تھا۔ کئی سال بہت زیادہ کام کرتے رہنے کی وجہ سے ساورکر کی صحت اب بہت خراب ہونے لگی تھی۔

گاندھی جی نے بہت کوشش کی کہ مسٹر جناح کو پاکستان بنانے سے باز رکھیں لیکن جناح نہیں مانے۔ اب پاکستان کے قیام کی بات ایک حقیقت بنتی جا رہی تھی۔ جس ریل گاڑی میں بیٹھ کر گاندھی جی جناح سے ملنے جا رہے تھے اس کے راستہ میں پڑنے والے بہت سے اسٹیشنوں پر ہندو سنگٹھن کے ممبروں نے کالے جھنڈے دکھا کر زبردست مظاہرے کیے۔ ساورکر نے قوم سے محبت رکھنے والے سبھی لوگوں سے اپیل کی کہ وہ ہندوستان کے ٹکڑے نہ ہونے دیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے 1944 میں 'اکھنڈ ہندوستان' کے لیڈروں کی ایک کانفرنس بھی بلائی۔ اس کانفرنس میں 300 لیڈروں نے شرکت کی جن میں پنجاب کے ماسٹر تارا سنگھ اور پوری کے شنکر آچاریہ بھی شامل تھے۔

۱۹۴۵ میں بابو راؤ ساورکر اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ ساورکر بیمار ہی چل رہے تھے، بھائی کی موت سے ان کو زبردست دھکا لگا۔ ہندو مہا سبھا کی صدارت سے انھوں نے پہلے ہی استعفیٰ

دے دیا تھا۔

تنظیم کا سرگرم رہنما (بابوراؤ) اب اس دنیا میں تو نہیں رہا تھا۔ 1945 کے عام انتخابات میں ہندو مہا سبھا کی ہار بھی ہو گئی تھی۔ ساورکر اچھی طرح سمجھتے تھے کہ متحد ہندوستان کی جنگ ہاری جا چکی ہے۔ ان کو دل کا دورہ پڑا اور ان کی یادداشت بھی بہت خراب ہو گئی۔

ہندوستان آزادی کی طرف بڑھ رہا تھا مگر اس دوران ملک میں جگہ جگہ زبردست فرقہ وارانہ جھگڑے شروع ہو گئے۔ ساورکر نے اعلان کیا کہ ہندوستان کی تقسیم معاشی طور پر تباہ کن اور سیاسی طور پر بے وقوفی کی بات ہو گی۔ جب ان کی اعصابی کمزوری میں تھوڑا سدھار آیا تو انھوں نے ہندوستان کو متحد بنائے رکھنے کے لیے پرزور اپیلیں کیں۔

فروری 1947 میں حکومت برطانیہ نے اعلان کیا کہ جون 1948 سے پہلے پہلے ہندوستان کی حکومت کی باگ ڈور ہندوستانیوں کو سونپ دی جائے گی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان پہنچ گئے۔ وہ ہندوستان کے آخری وائسرائے تھے۔

ساورکر نے وائسرائے سے اصرار کیا کہ وہ کوئی بھی بنیادی تبدیلی لانے سے پہلے ہندو مہا سبھا کے صدر اور ماسٹر تارا سنگھ سے ضرور بات چیت کر لیں کیوں کہ ایسا نہ کرنے سے ہندوستان کی اکثریت والی آبادی پر اثر پڑے گا۔ انھوں نے بنگال اور آسام کو یہ بات بھی جتائی کہ پاکستان بننے سے ان صوبوں میں بڑی تعداد میں ادھر ادھر سے مسلمان آ کر آباد ہو جائیں گے۔ انھوں نے کانگریس سے بھی اپیل کی کہ وہ مادر وطن کے ٹکڑے کرنے کی بات مان کر ملک کے شہریوں کو دھوکہ نہ دے۔

3/ جولائی 1947 کو ہندو مہا سبھا نے پورے ہندوستان میں پاکستان کی مخالفت کرنے کے لیے ایک دن منایا اور اس بات پر زور دیا کہ ہندوستان کی تقسیم سے قومی بہادروں کی امیدوں پر پانی پھر جائے گا۔ لیکن حالات کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ ساورکر کی ان کوششوں کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔

15/ اگست 1947 کو ہندوستان آزاد ہو گیا۔ ساورکر نے بڑے فخر کے ساتھ ہندوستان کے قومی جھنڈے کے ساتھ ہندو مہا سبھا کا کیسری جھنڈا بھی لہرایا۔

جب ہندوستان اپنی آزادی کی خوشیاں منا رہا تھا پنجاب اور سندھ میں قتل و غارت کی آگ بھڑک اٹھی۔ لاکھوں لوگ بے گھر ہوگئے اور بڑی تعداد میں ہندوستان بھاگ آئے۔

اس افراتفری کے عالم میں اکتوبر 1947 میں پاکستان نے کشمیر پر حملہ کر دیا۔ 13/ جنوری 1948 کو گاندھی جی نے امن کے قیام اور مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے اپنا برت شروع کر دیا۔ سترہ دن بعد 30/ جنوری کو مہاتما گاندھی کا قتل ہو گیا۔ گاندھی جی کے قتل سارے ہندوستان میں دکھ اور بے چینی کی لہر پھیل گئی۔ آنے والے دن ساورکر کے لیے ایک بھیانک خواب جیسے تھے۔

گاندھی جی کا قاتل ناتھورام گوڈسے، کسی زمانہ میں آر۔ایس۔ایس کا ایک کارکن رہا تھا۔ آر۔ایس۔ایس کو ہندو مہاسبھا کی ایسی شاخ سمجھا جاتا تھا جو تشدد میں یقین رکھتی تھی۔ گوڈسے ہندو مہاسبھا کی آل انڈیا کمیٹی کا ایک ممتاز ممبر بن گیا تھا۔

ساورکر نے گاندھی جی کے وحشیانہ قتل اور اپنے ہی بھائیوں کو مارنے کے جرم کی سخت مذمت کی۔ اس قسم کی باتیں نئے نئے آزاد ہوئے ملک کے لیے واقعی بہت نقصان دہ تھیں۔

ہندو مہاسبھا اور آر۔ایس۔ایس کے کارکنوں کو بڑی تعداد میں گرفتار کیا جانے لگا۔ گاندھی جی کے قتل کی سازش کے الزام میں 4/ فروری 1948 کو ساورکر کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔

دہلی کے لال قلعہ میں ایک کافی لمبا مقدمہ چلا جس میں 149 گواہوں کے بیانات پر بحث ہوئی۔ گوڈسے اور قتل میں شامل ایک دوسرے شخص، آپٹے نے بیان دیا کہ ساورکر کا اس قتل سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اپنے 52 صفحات کے بیان میں ساورکر نے بتایا کہ اس مجرمانہ منصوبہ کی ان کو خبر تک بھی نہیں تھی۔ عدالت میں انھوں نے اپنا بیان دیتے ہوئے کہا تھا ''آزادی کی جنگ میں ایک سپاہی کی حیثیت سے میں پچاس سال تک لڑتا رہا ہوں۔ اس سلسلہ میں میں نے بھی بہت سی تکلیفیں اٹھائیں اور قربانیاں دیں۔ ہندوستان ایک آزاد ملک بن گیا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اپنے ملک کو آزاد دیکھنے کے لیے میں زندہ رہا۔'' بیان دیتے دیتے ساورکر کا گلا رندھ گیا اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ عدالت میں سناٹا چھا گیا۔
10/ فروری 1949 کو ۸۴ ساعتوں کے بعد ساورکر کو باعزت بری کر دیا گیا۔

دور اندیشی

ساورکر کی صحت بہت خراب ہوگئی تھی اور اب وہ سیاسی زندگی سے کنارا کشی اختیار کرنا چاہتے تھے۔ 1949 میں مراٹھی زبان میں ان کی خود کی لکھی ہوئی سوانح عمری "مزیا اٹھاونی" (میری یادیں) کا پہلا حصہ شائع ہوا۔ اب بھی نئے نئے آزاد ہوئے ملک کی آزادی کا خیال ان کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں بسا رہتا تھا اور اس بات سے ان کو بڑی تقویت ملتی تھی۔

دستور ساز اسمبلی نے مذہب اور ذات پات کی بنیاد پر الگ الگ الکشن لڑنے کی بات کو رد کر دیا۔ ساورکر نے سردار ولبھ بھائی پٹیل کو اس بات کے لیے مبارک باد دی۔ ولبھ بھائی پٹیل ہمیشہ ساورکر سے مدد لیتے رہتے تھے۔ اب ملک کی قومی زبان، اس کے رسم الخط اور ملک کے نام وغیرہ کے مسائل سامنے آنے لگے۔ ساورکر نے دستور ساز اسمبلی کے صدر کو مشورہ دیا کہ اس ملک کا نیا نام "بھارت" رکھا جائے اور اس کی قومی زبان ہندی ہو جس کو دیوناگری رسم الخط میں لکھا جائے۔ ان کی یہ باتیں مان لی گئیں۔

ساورکر کو اس بات کے لیے راضی کر لیا گیا کہ وہ دسمبر 1949 میں کلکتہ میں ہونے والے ہندو مہاسبھا کے اجلاس کا افتتاح کریں۔ اس اجلاس میں ہزاروں لوگوں نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔

26 جنوری 1950 کو ہندوستان ایک جمہوریہ بن گیا۔ ساورکر کو یہ امید تھی کہ ملک کے دفاع کے لیے فوجوں کے مضبوط بنانے کی بات کو سب سے زیادہ اہمیت دی جائے گی۔

مشرقی بنگال میں بھیانک فسادات شروع ہوگئے۔ حالاں کہ ساورکر نے فرقہ داریت کے مسئلہ پر اپنی زبان تک نہیں کھولی تھی لیکن اپریل 1950 میں احتیاطی نظر بندی قانون کے تحت ان کو ہندو مہاسبھا اور آر۔ ایس۔ ایس کے دوسرے بہت سے کارکنوں کے ساتھ بمبئی میں گرفتار کر لیا گیا۔ تین مہینے بعد ان کو اس شرط پر رہا کر دیا گیا کہ وہ ایک سال تک سیاست سے الگ رہیں گے۔

ساورکر اب بالکل تھک چکے تھے۔ انھوں نے اس موقع کو غنیمت جانا۔ پھر بھی سماجی مسئلوں

میں ان کی دلچسپی بنی رہی۔ جس زمانہ میں ملک میں کھانے کی بہت زیادہ کمی ہو گئی تھی تو ساورکر نے لوگوں کو مچھلی کھانے کا مشورہ دیا تھا اور کہا تھا کہ صحت مند غذا کھانے سے ہماری قوم مضبوط بنے گی۔ کھانے کی کمی کے سلسلہ میں انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ کھانے کی چیزوں اور اناج کو ٹھیک ڈھنگ سے رکھنے اور چوہوں وغیرہ سے محفوظ کرنے سے بھاری نقصان سے بچا جاسکتا ہے۔ ساورکر محنت سے کام کرنے پر بہت زور دیتے تھے ان کا کہنا تھا کہ اب جب کہ ملک کو آزادی مل گئی تھی ہندوستانیوں کو انقلابی سرگرمیوں کی بجائے ترقی کے کاموں میں لگ جانا چاہیے اور دستوری طریقوں سے اپنے مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔

1958 میں پونا یونی ورسٹی نے ساورکر کو ڈی۔ لٹ کی ڈگری دی۔

ساورکر بہت سی باتوں کا پہلے سے ہی اندازہ لگالیا کرتے تھے اور ان پر سنجیدگی کے ساتھ گفتگو کیا کرتے تھے۔ ان کی بہت سی پیشین گوئیاں اب سچ ثابت ہو رہی تھی۔ 1962 میں چین نے ہندوستان پر حملہ کر دیا تھا تو ساورکر بری طرح رو پڑے تھے۔

1965 میں پاکستان نے ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ جب ہندوستانی فوجیں لاہور میں داخل ہوئیں تو ساورکر کو بہت خوشی ہوئی۔ اس موقعہ پر انھوں نے کہا تھا کہ "جنگ جیتنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ جنگ دشمن کی سرزمین پر لڑی جائے۔"

ان کی خود لکھی سوانح عمری کا آخری حصہ 1965 میں شائع ہوا اور 27/ فروری 1966 کو وہ اس دنیا سے کوچ کر گئے۔

ویر ساورکر کی زندگی بہادری کے کارناموں سے بھری ہوی تھی۔ ایک مقصد تھا جس کو وہ جی جان سے حاصل کرنا چاہتے تھے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انھوں نے سخت جدوجہد اور قربانی کا راستہ اپنایا تھا۔ شہرت اور دولت کے لالچ میں وہ کبھی نہیں پڑے۔ ہندوستان کی قومیت اور اتحاد کے سلسلہ میں ساورکر کی دور رس نگاہ اور معقولیت پہلے کی طرح آج بھی اتنی ہی کار آمد ہے۔

کے۔ کامراج

ٹی۔ پکشی راجن

"تاریخ میں ایسی مثالیں شاذونادر ہی نظر آتی ہیں، جن میں کوئی ایسا شخص جسے نہ پیدائش کے ساتھ کوئی امتیاز ملا ہو، نہ کوئی رتبہ نہ مال و دولت نہ تعلیم، لیکن وہ کامراج کی طرح عظیم ذمہ داریوں اور معتبر حیثیتوں پر فائض ہوا ہو۔

آر۔ وینکٹارمن

کے۔ کامراج

اس عظیم رہنمائی زندگی کی سب سے بڑی خصوصیات اس کی سادگی تھی۔ وہ ایک عوامی انسان تھے۔ ان کے پاس نہ جائیداد تھی نہ دولت۔ بس ایک خاندانی نام تھا جو ان کو ملا تھا اور وہ بھی استعمال کرنا انھوں نے چھوڑ دیا تھا۔ اس طرح وہ کمار سوامی کامراج نادر' سے صرف 'کامراج' بن گئے تھے۔

عوام اور بڑے بڑے رہنماؤں پر ان جیسے معمولی انسان کا کس قدر اثر تھا اس کی مثالیں بہت کم ملیں گی ۔ کفایت شعاری اور انسانوں کی خدمت، گاندھی جی کی زندگی کے یہ دو بڑے اصول تھے۔ کامراج کی زندگی بھی انہیں اصولوں پر چلتی رہی۔ لوگ کامراج کو گاندھی جی کا آخری وارث کہا کرتے تھے۔ جب انھوں نے شمالی ہندوستان کا دورہ کیا تو لوگ ان کو پیار سے ''کالا گاندھی'' کہنے لگے۔

کامراج نے شادی بھی اسی لیے نہیں کی کہ وہ گھریلو ذمہ داریوں سے آزاد رہ کر، پورے خلوص اور لگن کے ساتھ اپنے ملک کی خدمت کر سکیں۔ وہ بڑے ڈسپلن کے ساتھ، پر سکون زندگی گزارتے تھے۔ آگے چل کر جب ان کو اعلیٰ عہدے ملے اور ان کے ہاتھوں میں طاقت آئی تب بھی انھوں نے اپنی زندگی میں اسی سادگی کو اپنائے رکھا۔ ہاتھ میں طاقت آنے پر بھی ان کے کردار میں کوئی خرابی پیدا نہیں ہوئی۔ وہ ایک سیدھی سادی دھوتی اور کہنیوں تک کی کھادی کی قمیض پہنا کرتے تھے اور پوری طرح 'عوام کے آدمی' لگتے تھے۔

وہ ایک عام معمولی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے لیکن اپنی محنت، لگن اور وطن سے سچی محبت

رکھنے کی وجہ سے وہ تامل ناڈو کے وزیر اعلیٰ اور پھر آل انڈیا کانگریس کے صدر بنے۔ وہ اس قسم کی انسان تھے کہ نہرو جی ان پر پورا بھروسہ کرتے تھے اور ان کو اپنا ایک اچھا ساتھی سمجھا کرتے تھے۔ ایک معمولی سے لڑکے نے غریبی اور مشکل حالات کا سامنا کرتے ہوئے، صبر و استقلال کے ساتھ، اپنی زندگی میں بہت کچھ حاصل کر دکھایا۔ کامراج کی زندگی ایسی ترقی کی ایک مثال تھی اور اس قسم کی مثالیں دنیا میں بہت کم ملتی ہیں۔

بچپن

کامراج 15/ جنوری 1903 کو ایک درمیانی درجہ کے خاندان میں، وردھوپٹی میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ جگہ آج کل ورودھونگر کہلاتی ہے۔ ان کے خاندان کے لوگ تجارت کرتے تھے۔ ان کے والد کمار سوامی نادر ناریل کی تجارت کرتے تھے۔ ان کی ماں کا نام سِوااکامی امّل تھا۔ اپنے پہلے بچے کا نام انھوں نے اپنے خاندان کی دیوی کے نام پر 'کاماکشی' رکھا لیکن پیار سے ان کو 'راجہ' کہا جاتا تھا۔ جلد ہی دونوں نام مل کر ایک ہوگئے اور اس بچے کا نام 'کامراج' ہو گیا۔

جیسا اس زمانہ کا دستور تھا، پانچ سال کا ہونے پر کامراج کو ایک مقامی ابتدائی اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ اس اسکول کا نام "نے نارو دیالیہ" تھا لیکن تھوڑے دن بعد ان کو چھتریہ ودیالیہ نام کے ہائی اسکول میں بھیج دیا گیا۔ بدقسمتی سے ایک سال کے اندر ان کے والد کی موت ہوگئی۔ کامراج کے دادا کی موت کے تھوڑے ہی دنوں بعد ان کے والد چل بسے تھے۔ خاندان کی روزی روٹی کا سہارا وہی تھے۔ ظاہر ہے سارے خاندان کو ان دونوں کی موت سے گہرا صدمہ پہنچا۔

کامراج کی ماں نے اپنے کانوں کے بندوں کے علاوہ اپنے سارے زیور بیچ ڈالے۔ یہ سارا روپیہ انھوں نے ایک مقامی تاجر کے پاس جمع کر دیا اور اس کے سود سے جو پیسہ ملتا تھا اسی سے جوں توں کر کے وہ اپنے بچوں کی پرورش کرنے لگیں۔

پہلی بار کامراج کو غریبی کی تکلیف کا احساس ہوا۔ وہ ابھی بچے ہی تھے لیکن زندگی کی کڑوی حقیقتوں سے انھوں نے وہ قیمتی سبق سیکھے جو کسی اسکول میں نہیں سکھائے جاتے۔ جب ان

کے ہاتھوں میں طاقت آئی تو وہ بچپن میں سیکھے اُس سبق کو نہیں بھولے اور انھوں نے اس طرح کی بنیادی پالیسیاں بنائیں اور وہ کام کیے جن سے غریب عوام کو بہت فائدہ پہنچا۔ انھوں نے ایک بارہ کہا تھا" صرف غریب لوگ میرے رشتہ دار ہیں۔ میری زندگی کا یہی مقصد ہے کہ میں ان کی مدد کروں اور ایسے کام کروں کہ ان کی ترقی ہو۔" واقعی انھوں نے ایسا کیا بھی اور لوگ ان کو 'اَزہائی پنکلن' یعنی غریبوں کا دوست کہنے لگے۔

انگریزی کے شاعر ورڈس ورتھ نے کہا تھا" بچہ آدمی کا باپ ہوتا ہے۔" کامراج کی زندگی میں ہونے والے دو واقعات سے ان کے کردار کی خاص خوبیوں پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ خوبیاں ان کے بڑے ہونے کے بعد ابھر کر سامنے آئیں اور ان ہی خوبیوں نے ان کو ایک عظیم رہنما اور سیاست داں بننے میں مدد دی۔

ایک بار ان کے اسکول میں گنیش چترتھی کا تیوہار منایا جا رہا تھا۔ سبھی لڑکوں نے اس کے خرچ کو پورا کرنے کے لیے پیسے دیے تھے۔ جب پوجا کے بعد پرساد تقسیم کرنے کا وقت آیا تو سب لڑکے زیادہ سے زیادہ پرساد لینے کے لیے ٹوٹ پڑے۔ چھوٹے سے کامراج چپ چاپ ایک کونے میں بیٹھے تماشہ دیکھتے رہے۔ آخر جب ہنگامہ تھما تو ان کی باری آئی اور ان کو بہت تھوڑا سا پرساد مل سکا۔

ان کی دادی نے پوچھا" تمھیں اتنا تھوڑا سا پرساد کیوں ملا؟ تم زیادہ پرساد پانے کے لیے دوسرے بچوں کی طرح آگے کیوں نہیں بڑھے؟" کامراج نے فوراً جواب دیا" کیوں! میں ایسا کیوں کرتا؟ کیا یہ خود استاد کا فرض نہیں ہے کہ وہ سب کو برابر پرساد دیں۔ میں نے بھی دوسرے لڑکوں کے برابر پیسے دیے تھے۔"

کامراج ہمیشہ سارے انسانوں کو برابر سمجھتے رہے وہ سب کے ساتھ انصاف چاہتے تھے۔ بچپن میں ان کے ذہن میں جو بیج بوئے گئے تھے وہ آگے چل کر ان کے "سادھرم" یعنی 'برابری اور انصاف' کے فلسفہ کا ایک تناور درخت بن گئے۔

ایک دن انھوں نے دیکھا کہ مندر کا ہاتھی ندی سے نہا کر لوٹا تو پاگل سا ہو گیا۔ ہاتھی گلیوں میں اودھم مچا رہا تھا اور لوگ ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ کامراج نے دیکھا کہ ہاتھی کی سونڈ

میں جو لوہے کی زنجیر پڑی رہتی تھی اُس وقت غائب تھی۔ وہ دوڑ کر مندر گئے اور وہاں سے وہ زنجیر لے آئے اور زنجیر ہاتھی کے سامنے پھینک دی۔ ہاتھی نے زنجیر اپنی سونڈ سے اٹھائی اور اس کے ساتھ ہی جیسے اس پر جادو کا اثر ہوا ہو، وہ پرسکون ہو گیا۔ اس بات سے سب کو بہت تعجب ہوا اور لوگوں نے اطمینان کی سانس لی۔ کامراج نے کسی قسم کی گھبراہٹ بغیر ہاتھی کو مندر پہنچا دیا۔ اس واقعہ کے بعد سے وہ ہاتھی کامراج کا دوست بن گیا۔

آگے چل کر یہی بے خوفی اور یہی حاضر دماغی کامراج کے کام آئی۔ اپنی سیاسی زندگی میں ان کو 'جنگلی ہاتھیوں، کی کس طرح کے بہت سے لوگوں سے واسطہ پڑا لیکن انھوں نے ان سب پر قابو پالیا۔

ان پڑھ

پتہ نہیں کیوں کامراج کا دل پڑھائی میں نہیں لگتا تھا۔ وہ ہمیشہ کھیل کود شرارت کے موڈ میں رہتے تھے اور اپنے ساتھیوں کو خوش کرنے کے لیے جادو کے کرتب دکھایا کرتے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اکلوتا بیٹا ہونے کی وجہ سے ان کو اپنے گھر والوں کا بہت زیادہ لاڈ پیار ملا تھا۔ جب وہ چھٹی کلاس میں تھے تو انھوں نے اسکول جانا بند کر دیا اور وردھوپٹی میں ہی اپنے ماموں کی کپڑے کی دکان میں کام کرنے لگے۔ ان کے ماموں کا نام کروپیا تھا۔

جب کامراج عوامی زندگی کے میدان میں اترے تو انھیں اپنی اتنی کم پڑھائی کی وجہ سے کافی مشکل کا سامنا کرنا پڑا اور انھیں احساس ہوا کہ تعلیم اور علم زندگی میں بہت اہم چیزیں ہیں۔ اپنی تعلیم کی کمی کو انھوں نے اس زمانہ میں پورا کیا جب وہ جیل میں تھے۔ اپنے ساتھی ناگاراجن سے انھوں نے انگریزی بھی سیکھی۔ ان کے دوستوں نے ان کو پرانے ادب، ناولوں اور دوسری کتابوں سے بھی روشناس کرلیا۔

جب کبھی کوئی شخص نکتہ چینی کرتے ہوئے کامراج کی تعلیم کی کمی کی بات کرتا تو وہ کہتے " لوگ کہتے ہیں میرے پاس کوئی ڈگری نہیں ہے اور میں نے جغرافیہ نہیں پڑھا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ میں نہ کسی کالج میں پڑھا ہوں اور نہ میں نے کالج میں جغرافیہ پڑھا ہے۔ لیکن اپنے

طور پر مجھے جغرافیہ کا کافی علم ہے۔ میں اپنے صوبے کے کونے کونے میں آباد تمام گانوؤں کو جانتا ہوں اور ان تک جانے والی سڑکوں کا بھی مجھے پتہ ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ میرے صوبہ میں کون کون سے دریا ہیں اور کون کون سی جھیلیں ہیں اور ان کے پانی سے کس طرح فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ میں لوگوں کو بھی جانتا ہوں اور ان کے کاموں اور مسئلوں کا بھی مجھے علم ہے۔ شمالی ہندوستان میں میں بہت سی جگہوں پر گیا ہوں۔ اگر میری معلومات جو میں نے اپنے تجربے سے حاصل کی۔ ہے جغرافیہ کا حصہ نہیں ہیں تو میں جغرافیہ سے ناواقف ہی بھلا"۔

اپنے بارے میں کامراج جب اس قسم کی بات کہتے تھے تو غرور یا فخر کی وجہ سے نہیں بلکہ بڑی نرمی کے ساتھ کہتے تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ کامراج باقاعدہ تعلیم کے مخالف تھے۔ 1954 میں جب وہ وزیر اعلیٰ بنے تو انھوں نے تعلیم کو سب سے زیادہ اہمیت دی اور لاکھوں بچوں کو مفت تعلیم کی آسانی دلانے کے لیے بہت کام کیا۔ جب کوئی غریب بچہ اپنی پڑھائی جاری رکھنے کے لیے ان سے مدد مانگتا تو وہ فوراً اس کی مدد کر دیتے تھے اور اس کو مشورہ دیتے تھے کہ "خوب پڑھو۔"

یہ سچ ہے کہ انھوں نے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی لیکن قدرت نے ان کو ایک تیز ذہن، ہوشیاری اور انسانی فطرت کی اچھی سمجھ بوجھ دی تھی۔ وہ بہت جلد انسانوں اور معاملوں کو سمجھ لیتے تھے، تیزی کے ساتھ صحیح بات جان لیتے تھے اور بڑی آسانی سے مشکل سے مشکل معاملہ کا حل ڈھونڈ لیتے تھے۔ اسی وجہ سے جو لوگ ان کو پسند کرتے تھے وہ ان کو 'پاڈی کتھا میتھائی' یعنی 'ان پڑھ ذہین' کہا کرتے تھے۔

زندگی کا ایک نیا موڑ

شاید سیاست کامراج کے خون میں شامل تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ساری قوم انگریزوں کی حکومت کے ظلم و ستم کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور بال گنگادھر تلک، گوپال کرشن گوکھلے اور لالہ لاجپت رائے جیسے عظیم لیڈروں کی رہنمائی میں بہادری کے ساتھ غلامی کی زنجیریں توڑنے اور آزادی حاصل کرنے کی لڑائی لڑ رہی تھی۔

صرف تیرہ سال کی عمر میں کامراج اپنے آس پاس ہونے والی سیاسی سرگرمیوں اور انڈین نیشنل کانگریس کے کاموں میں غیر معمولی دلچسپی دکھانے لگے تھے۔ ایک قومی اخبار "سودیش مترن" کو وہ بڑے شوق سے پڑھتے تھے اور دکان بند کرنے کے بعد اپنے دوستوں کے ساتھ اُس اخبار کی خبروں پر بحث کیا کرتے تھے۔

کامراج، اینی بیسینٹ کی 'ہوم رول' یعنی ہندوستانیوں کی اپنی حکومت کی مانگ سے بہت متاثر تھے۔ بنکم چندر چٹر جی کے گیت 'وندے ماترم' کا تامل میں ترجمہ عظیم شاعر سبرامینا بھارتی نے کیا تھا۔ اس زبردست قومی گیت کا بھی کامراج کے دماغ پر بہت گہرا اثر پڑا تھا۔ وہ اکثر دکان سے نکل بھاگتے تھے اور جلسے جلوسوں میں شامل ہو جاتے تھے۔ جلسوں میں ڈاکٹر ورادارا جولو نائیڈو اور جارج جوزف جیسے عظیم مقرروں کی تقریریں سننے کا انھیں بہت شوق تھا۔

کامراج کے گھر والوں کی ان سے یہ امید یہ تھی کہ وہ گھر کی ذمہ داری سنبھالیں گے۔ ان حرکتوں سے ان کو خاصی پریشانی ہونے لگی۔ انھوں نے ان کا ذہن سیاست کی طرف سے ہٹانے کی بہت کوشش کی۔ ان کو تھروواننتاپورم بھیج دیا گیا جہاں ان کے دوسرے ماموں کی لکڑی کی دکان تھی لیکن ان کی باغیانہ فطرت نے وہاں بھی ایک راستہ ڈھونڈ نکالا۔ وہ وائیکوم ستیہ گرہ میں شامل ہوئے۔ یہ وہ ستیہ گرہ تھی جو اونچی ذات کے ذریعہ ہری جنوں پر کیے گئے مظالم کے خلاف کانگریس چلا رہی تھی اس لیے ان کو گھر واپس بلا لیا گیا۔

لوگوں نے صلاح دی کہ ان کی شادی کر دی جائے۔ بڑی مضبوطی کے ساتھ کامراج نے اپنے بڑوں کا یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا اور عہد کیا "میں قوم کے لیے ہمیشہ اور مسلسل کام کرتا رہوں گا۔" گھر والے ان کو شادی کے لیے مجبور کرتے رہے اور اُدھر ان کی وطن سے محبت اور آزادی کی لڑائی میں شامل ہونے کی خواہش اور زیادہ بڑھتی گئی اور ان کی گھر والے کچھ نہ کر پائے۔

اس وقت تک مہاتما گاندھی قومی سیاست کے میدان میں آچکے تھے اور وطن کی رہنمائی کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں آگئی تھی۔ اور پھر 1919 میں ہندوستانیوں کو ذلیل کرنے والا رولٹ ایکٹ آیا جس کو ہندوستانیوں نے 'کالا قانون' کہا کیوں کہ اس قانون کے تحت

حکومت کسی پر بغیر کوئی الزام لگائے اور بغیر مقدمہ چلائے جیل میں بند کر سکتی تھی۔ اس کے بعد 13 / اپریل کو جلیانوالا باغ کا شرمناک حادثہ ہوا۔ جنرل ڈائر نے سینکڑوں بے قصور نہتے مرد عورت اور معصوم بچوں کو گولیوں سے بھون ڈالا۔ یہ وہ موڑ تھا جس نے کامراج کی آئندہ زندگی کا راستہ طے کر دیا۔

کامراج کی عمر سولہ سال کی تھی جس وقت وہ کانگریس کے باقاعدہ ممبر بن گئے تھے اور اس کے کاموں میں پورا وقت لگانے لگے تھے۔ وہ پارٹی کے لیے چندہ جمع کرنے، جلسوں کا انتظام کرنے اور مقررین کو بلانے وغیرہ جیسے کاموں میں لگ گئے۔ اب واپسی کا کوئی سوال نہیں تھا۔ اگلے چھ سال وہ قومی تحریک اور ملک کی تعمیر کی سرگرمیوں میں بڑی گرم جوشی کے ساتھ کام کرتے رہے۔

برطانوی حکومت کے خلاف کوئی ایسا احتجاج یا جلسہ نہیں ہوا جس میں کامراج نے حصہ نہ لیا ہو۔ مارچ 1930 میں مہاتما گاندھی نے مشہور "نمک ستیہ گرہ" شروع کی اور ڈانڈی کی طرف مارچ کیا۔ جنوبی ہند میں سی راج گوپال آچاریہ (راجہ جی) نے ویڈارنایم کی طرف مارچ کی قیادت کی۔ کامراج اپنے ساتھیوں کی ٹولی لے کر اس مارچ میں شامل ہوئے۔ ان کو گرفتار کر کے دو سال کے لیے علی پور جیل بھیج دیا گیا۔ جیل جانے کا یہ ان کا پہلا موقع تھا۔ اُس وقت ان کی عمر 27 سال تھی۔ گاندھی اروِن سمجھوتہ کی وجہ سے ان کو 1931 میں جیل سے رہا کر دیا گیا۔

ابھی دو سال بھی نہیں گزرے تھے کہ کامراج کو ورودھونگر بم کیس کے معاملے میں خواہ مخواہ پھنسا لیا گیا۔ ڈاکٹر ورادا راجولو نائیڈو اور جارج جوزف نے ان کے مقدمہ کی پیروی کی اور ان کو بری کرالیا۔

جب انگریزی حکومت نے وار فنڈ کے لیے پیسہ جمع کرنا شروع کیا تو کامراج نے اس کی سخت مخالفت کی اور ان کی کوششوں سے وار فنڈ جمع کرنے کے کام میں کافی رکاوٹ بھی پڑی لیکن وہ حکومت کے غصہ کا شکار ہو گئے۔ 1940 میں جب وہ ستیہ گرہ کرنے والوں کی فہرست کی منظوری لینے کے لیے گاندھی جی سے ملنے واردھا جا رہے تھے تو ان کو راستہ میں ہی گرفتار

کر لیا گیا اور ویلور کی جیل میں بند کر دیا گیا۔

اسی زمانہ میں وردو ھونگر میں ایک دلچسپ واقعہ ہوا۔ مقامی لوگوں نے اتفاق رائے سے کامراج کو میونسپل کونسل کا صدر چن لیا اور نو مہینے تک ان کے جیل سے رہا ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ آخر جب وہ جیل سے رہا ہوئے تو سیدھے میونسپلٹی کے دفتر گئے اور چند منٹ تک صدر کی کرسی پر بیٹھے اور پھر اپنا استعفیٰ دے دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کو پورے ملک کے لیے زیادہ بڑی ذمہ داریاں اٹھانی ہیں اس لیے وہ مقامی معاملات میں الجھنا نہیں چاہتے۔ ان کا اصول تھا "اگر کوئی شخص کوئی ذمہ داری پوری طرح نہ نبھا سکے تو اس کو وہ ذمہ داری قبول ہی نہیں کرنی چاہیے"۔

8/اگست 1942 کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی میٹنگ بمبئی میں ہوئی اور گاندھی جی نے 'ہندوستان چھوڑو' تحریک شروع کرتے ہوئے ڈنکے کی چوٹ 'کرو یا مرو' کا اعلان کر دیا۔ ملک میں ہل چل مچ گئی اور سارے ملک میں پھیلی گرماگری پر قابو پانا حکومت کو ناممکن نظر آنے لگا۔ کامراج اس تاریخی کانفرنس میں شامل ہوئے تھے اور اپنے ساتھ پروپیگنڈا کرنے کے کتابچے اور پمفلٹ وغیرہ لے کر اپنے شہر لوٹے تھے۔ اپنے دوستوں کی مدد سے سارے صوبہ میں انھوں نے گاندھی جی کا پیغام پھیلا دیا اور پھر خود کو پولس کے حوالہ کر دیا۔ اس بار ان کو تین سال کی سزا ہوئی اور امراوتی جیل میں رکھا گیا۔

کل ملا کر کامراج نو سال جیل میں رہے۔ جیل میں رہ کر انھوں نے اپنے وقت کا صحیح استعمال کیا اور بہت سی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ اس طرح ان کے علم میں خاصہ اضافہ ہوا۔ جیل کی زندگی میں انھیں قوم پرستی کے مختلف رنگ دیکھنے کا بھی موقع ملا۔ ان سب چیزوں نے ان کی فطری سمجھ داری میں اور اضافہ کیا۔

کامراج کے سیاسی گرو

اب کامراج الکشن میں کامیاب ہو کر صوبائی کانگریس کمیٹی میں شامل ہو گئے تھے اور ان کے کام کا حلقہ اپنے شہر کی سیاست سے بڑھ کر سارے صوبہ میں پھیل گیا تھا۔ یہ ان کی سیاسی

زندگی کی دوسری منزل تھی۔ اس زمانہ میں کانگریس کے اندر دو گروہ تھے۔ ایک گروہ شدت پسند تھا جو اس بات میں یقین رکھتا تھا کہ قومی تحریک کا مقصد ملک کی آزادی حاصل کرنا تھا اور یہ آزادی عوام کو براہِ راست سیاسی سرگرمیوں کے ذریعہ حاصل ہونی چاہیے تھی۔ اس گروہ کی قیادت ستیہ مورتی کے ہاتھ میں تھی۔ جو ایک بہترین مقرر اور پارلیمنٹ میں بہترین بحث کرنے والوں میں تھے۔۔ دوسرا گورہ نرم رویہ کا قائل تھا۔ اور اس کے لیڈر راجہ جی تھے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ دستوری طریقوں کی مدد سے برطانوی حکومت سے آزادی حاصل کرنی چاہیے۔ کامراج شدت پسند گروہ میں شامل ہو گئے۔

ستیہ مورتی ان دنوں مرکزی اسمبلی کے ممبر تھے۔ ان کے پاس تعلیم تھی، سیاسی رتبہ تھا اور وہ انگلش، تامل اور سنسکرت تین زبانیں جانتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ایک اچھے مقرر بھی تھے۔ کامراج میں ان سب چیزوں کی کمی تھی۔ ستیہ مورتی نے دیکھا کہ کامراج ایک محنتی، وفادار اور ان تھک کام کرنے والے نوجوان ہیں، ان میں تنظیم کی اچھی صلاحیت موجود ہے اور عوام سے ان کا گہرا تعلق ہے۔ ستیہ مورتی اور کامراج جب ایک دوسرے سے ملے تو ان کی یہ ملاقات ایک تاریخی ملاقات بن گئی۔ آنے والے زمانہ میں وہ ہمیشہ ایک دوسرے کے اچھے ساتھی ثابت ہوئے وہ ایک دوسرے کی عزت کرتے تھے اور ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ یہی بات ان کے تعلقات کی بنیاد بنی اور ایسے لگا جیسے دو روحوں کا ملاپ ہو گیا ہو۔

کامراج، ستیہ مورتی کو اپنا گرو، صلاح کار اور دوست سبھی کچھ سمجھتے تھے۔ دوسری طرف ستیہ مورتی کامراج کو اپنا دایاں ہاتھ سمجھتے تھے۔ وہ ان پر اتنا بھروسہ کرتے تھے کہ کبھی ان کے مشورے کے بغیرہ کوئی بڑا فیصلہ نہیں کرتے تھے۔

ایک بار ستیہ مورتی نے دہلی میں اپنے دوستوں سے کامراج کا تعارف یہ کہہ کر کرایا تھا 'کامراج تامل ناڈو میں کانگریس کے ایک ممتاز کارکن ہیں۔ یہ میرے ساتھی ہی نہیں بلکہ صلاح کار بھی ہیں'۔ ان دونوں کے ملنے سے ایک ایسی طاقت بن گئی جس کو اس وقت کے سیاسی شطرنج کے کھلاڑی نظر انداز نہیں کر سکے۔ 1936 میں ستیہ مورتی صوبائی کانگریس کے صدر بنے تو انھوں نے کامراج کو جنرل سکریٹری بنالیا۔ چار سال بعد وہ دونوں پھر ان عہدوں کے لیے منتخب ہوئے۔ ان کے مل جل کر کام کرنے کی وجہ سے پارٹی مضبوط بھی

ہوئی اور اس میں جوش بھی زیادہ پیدا ہوا۔ گاندھی جی اور نہرو جی نے ان کے کام کو بہت پسند کیا۔

28، مارچ 1943 کو جس زمانے میں کامراج امراوتی جیل میں تھے، ستیہ مورتی اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ کامراج کو یوں لگا کہ ان کی زندگی سے کوئی چیز کم ہو گئی ہے۔

کامراج کی بہت سی خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ اپنے دوستوں اور اپنے ساتھ کام کرنے والوں کو ہمیشہ پیار اور عزت کے ساتھ یاد رکھتے تھے۔ ستیہ مورتی کے لیے تو ان کے دل میں ایک خاص جگہ تھی۔ اس لیے جب ملک کو آزادی ملی تو کامراج سب سے پہلے اپنے اُن گرو کے گھر گئے اور وہاں جھنڈا لہرایا۔ اس طرح جب وہ وزیر اعلیٰ بنے تو سب سے پہلے ان ہی کے گھر گئے، ان کی تصویر کو مالا پہنائی اور ان کی بیوہ کو خراج عقیدت پیش کیا۔ کانگریس کے ساٹھویں اجلاس کا انتظام کرنے کی پوری ذمہ داری کامراج پر تھی۔ یہ اجلاس 1955 میں مدراس کے پاس اوادی کے مقام پر ہوا تھا۔ کامراج نے اُس عظیم رہنما کی یاد میں اجلاس کی جگہ کا نام "ستیہ مورتی نگر" رکھا تھا۔

سیاست کے میدان کے کھلاڑی

اپنی سیاسی زندگی میں کامراج کو جو سب سے بڑا لقب ملا وہ یہ تھا کہ لوگ ان کو 'بادشاہ گر' 'کنگ میکر' کہتے تھے۔ اس بات سے پتہ چلتا ہے کہ سیاست کے میدان میں وہ ایک زبردست کھلاڑی تھے اور سیاسی معاملات میں توڑ جوڑ کے ماہر تھے۔

جس دن وہ کانگریس کے ممبر بنے تھے اس دن کے بعد سے ہمیشہ وہ پوری طرح کانگریس کے وفادار رہے اور کانگریس کے ہی ساتھ جڑے رہے اور یہ بات ان کی ایک پہچان بن گئی تھی۔

جب تک کامراج زندہ رہے، 'کامراج کانگریس ہیں اور کانگریس کامراج ہے' والی بات ایک حقیقت بنی رہی۔ الکشن چاہے پارٹی کا ہو یا لیجسلیچر کا، اس میں وہی لوگ جیت پاتے تھے جن کے سر پر کامراج کا ہاتھ رہتا تھا۔ عوام سے ان کا گہرا تعلق بھی زندگی بھر بنا رہا اور یہی ان کی طاقت کا راز تھا۔ انتخابات چاہے برطانوی راج میں ہوئے چاہے آزاد ہندوستان میں، چاہے

الکشن خود ان کا ہو یا پارٹی کی طرف سے صوبائی لیجسلیچر کا، کامراج کو ہمیشہ کامیابی ملتی تھی اور اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ عوام سے ہمیشہ جڑے رہتے تھے۔ راجہ جی کو نئے زمانہ کا چانکیہ کہا جاتا تھا لیکن سیاسی توڑ جوڑ کے معاملہ میں کامراج ان سے بھی دو قدم آگے تھے۔

صوبہ مدراس میں 1946 سے 1950 تک کے چار سال کے عرصہ میں تین وزیر اعلیٰ ایک کے بعد ایک تیزی سے بدلے۔ یہ وزیر اعلیٰ تھے آندھرا کیسری پرکاسم، راماسوامی ریڈی یار اور کماراسوامی راجہ۔ اس بات سے ثابت ہوتا ہے کہ پارٹی کے فیصلوں پر کامراج کا کتنا زبردست اثر تھا۔ اُس زمانہ میں اندھرا پردیش، مالابار اور کرناٹک کے کچھ حصے مدراس پریسی ڈینسی میں شامل تھے۔

15 اگست 1947 کو ہندوستان غلامی کی لمبی نیند سے جاگا تو اس نے دیکھا کہ آزادی کی صبح بہت روشن ہے۔ مہاتما گاندھی کی قیادت میں بغیر تشدد کے، آزادی کے لیے جو لمبی جدو جہد چلی تھی اس کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ ہندوستان اب آزاد تھا۔ کامراج اور ان کی طرح ملک کے لاکھوں لوگوں نے قربانیاں دی تھیں۔ ملک کے لوگ بھی آزادی ملنے کے موقعہ پر بہت خوش تھے اور کامراج بھی۔ اس موقعہ پر انھوں نے اپنی تقریروں میں نئے ہندوستان کی تعمیر میں پیش آنے والی نئی مشکلوں کا بھی ذکر کیا اور غریب بھائیوں کے لیے روٹی، کپڑے، مکان اور دوسری بنیادی سہولیات بہم پہنچانے کی بھی بات کی۔

اگلے سال سارے ملک کو ایک ایسے افسوس ناک حادثہ سے گزرنا پڑا جس کی امید بھی نہیں تھی۔ 30 جنوری 1948 کو مہاتما گاندھی ایک قاتل کی گولیوں کا شکار ہو گئے۔ ملک میں غم و غصہ کی ایک زبردست لہر پھیل گئی تھی۔ کامراج یہ خبر سن کر پتھرا سے گئے۔ یہ پہلا موقعہ تھا جب ان کی آنکھوں میں کسی نے آنسو دیکھے تھے۔ عام طور سے ان کا چہرہ پر سکون رہتا تھا اور ان کے چہرے سے ان کی خوشی یا غم کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ وہ اپنے جذبات کا اظہار اپنے چہرے سے کبھی نہیں ہونے دیتے تھے۔ کوئی ان کے چہرے کو دیکھ کر کبھی بھی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں۔

مہاتما گاندھی کے بعد کامراج جواہر لال نہرو کی قیادت پر بھروسہ کرنے لگے اور انھوں نے

پارٹی معاملات میں نہرو جی کے ہاتھ مضبوط کرنے کے سلسلہ میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔

1950 میں ملک میں نیا دستور نافذ ہوا اور اس دستور کے تحت 1952 میں پہلے عام انتخابات ہوئے۔ کامراج پارلیمنٹ کے ممبر چن لیے گئے۔ لیکن یہ پہلا موقع تھا جب مدراس اسمبلی کے انتخابات کے معاملہ میں ان کے اندازے غلط ثابت ہوئے۔ مدراس میں کانگریس پارٹی کے نتیجوں سے کافی مایوسی ہوئی اور پارٹی اکثریت حاصل نہیں کر سکی۔

ایسے موقع پر پارٹی کو مشکل حالات سے ابھارنے کے لیے اور کانگریسی وزارت بنانے کے لیے راجہ جی سے مدد مانگی گئی۔ حالاں کہ راجہ جی سے کامراج کے کافی اختلافات رہے تھے لیکن راجہ جی جیسے عظیم سیاستداں کے لیے ان کے دل میں کبھی کوئی برائی نہیں آئی تھی۔ بلکہ وہ راجہ جی کی بہت عزت کرتے تھے۔ اس کے علاوہ کامراج تو ہمیشہ پارٹی اور قوم کے فائدہ کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ اس لیے جب ان سے مدد مانگی گئی تو کسی قسم کی ہچکچاہٹ بغیر وہ فوراً کچھ کرنے کو تیار ہو گئے۔

راجہ جی مدراس کے وزیر اعلیٰ بن گئے اور آزاد امیدواروں کی مدد سے انھوں نے اپنی وزارت بنالی۔ انھوں نے صوبہ کے انتظام میں کافی سدھار کیا اور عوام کی بھلائی کے لیے بہت سی اصلاحات کیں۔ دو سال کے اندر اندر انھوں نے تعلیم کی ایک نئی اور انوکھی پالیسی بنائی لیکن یہ ان کی بد قسمتی تھی کہ ہر طرف اس پالیسی کی سخت مخالفت ہوئی اور ان کو استعفیٰ دینا پڑا۔

وزیر اعلیٰ

اب تک کامراج دوسروں کو بادشاہ بناتے آئے تھے لیکن اب خود ان کے تاج پہننے کا وقت آگیا تھا۔ اپنے دوستوں اور پارٹی ہائی کمان کی خواہش کے سامنے ان کو جھکنا پڑا۔ ان کو عہدہ یا طاقت حاصل کرنے کی خواہش کبھی نہیں رہی تھی۔ لیکن ایسے حالات میں، نہ چاہتے ہوئے بھی 13/ اپریل 1954 کو انھیں مدراس کے وزیر اعلیٰ کا عہدہ سنبھالنا پڑا۔ اس عہدے کو قبول کرنے سے پہلے انھوں نے اپنے سارے ساتھیوں سے یہ وعدہ لے لیا تھا کہ ان میں سے کوئی بھی وزارت کی گدی پانے یا کوئی دوسری رعایت مانگنے کے لیے ان کے پاس نہیں آئے

گا۔ حالاں کہ ان کا رویہ نرمی اور انکساری کا رہتا تھا اور وہ اپنے کو پارٹی کا ایک عام رکن ہی سمجھتے تھے۔ لیکن ان میں لیڈر شپ کی صلاحیت بہت زیادہ تھی۔ کامراج کے زمانہ میں ہی مدراس کا نام "تامل ناڈو" رکھا گیا تھا۔

کامراج تین بار وزیر اعلیٰ منتخب ہوئے اور اس عہدے پر انھوں نے 2/ اکتوبر 1963 تک کام کیا اور اس کے بعد کچھ زیادہ بڑے کام کرنے کی غرض سے خود ہی انھوں نے یہ عہدہ چھوڑ دیا۔

کامراج کے زمانہ میں تامل ناڈو نے تقریباً ہر میدان میں زبردست ترقی کی اور یہ ریاست ترقی اور خوشحالی کا ایک نمونہ بن گئی۔ کامراج کی زبردست صلاحیت، ان کی انسانیت اور ترقیاتی کاموں میں ان کی حقیقت پسندی کی تعریف ان رہنماؤں نے بھی کی جو کانگریس چھوڑ کر کسی دوسری پارٹی میں شامل ہو گئے تھے۔ ان کی ان باتوں کی تعریف دنیا کے بہت سے لیڈروں نے بھی کی۔

پہلے پہل کامراج نے جو اپنی کیبنیٹ بنائی اس میں ان کا رویہ بڑا عجیب رہا۔ آٹھ وزیروں کی یہ چھوٹی سی کیبنیٹ تھی لیکن بہت عمدہ طریقہ سے بنائی گئی تھی۔ عوام کے فائدے کی بات کو مد نظر رکھتے ہوئے کامراج نے زیادہ تر پہلے سے ہی چلے آنے والے وزیروں کو کیبنیٹ میں شامل کیا اور اپنے وفاداروں کو چھوڑ دیا۔ سی۔ سبرامنیم جو کامراج کے مقابلہ میں لیڈر شپ کے لیے الکشن میں کھڑے ہوئے تھے اور ایم۔ بھگت وتسلم جنھوں نے ان کا نام کامراج کے مقابلہ میں پیش کیا تھا، کامراج نے ان دونوں کو بھی وزارت میں شامل کر لیا۔ قدرتی طور پر ان کے وفاداروں کو اس بات سے مایوسی ہوئی اور ان کے مخالف ان کی فراخ دلی پر حیران رہ گئے۔

اس بات کے باوجود کسی نے کامراج کی پسند پر اعتراض نہیں کیا کیوں کہ جن لوگوں کو وزیر بنایا گیا تھا وہ سب باصلاحیت لوگ تھے اور ان کو ان کی قابلیت کے لحاظ سے وزارت دی گئی تھی۔ مثال کے طور پر سی۔ سبرامنیم بعد میں مرکز میں وزیر مالیات (فائنانس منسٹر) بنے اور ایم۔ بھگت وتسلم کامراج کے بعد وزیر اعلیٰ بنے۔ آر۔ وینکٹ رمن کو کامراج نے اپنی دوسری کابینہ میں شامل کیا تھا۔ ان کو قانون اور ٹریڈ یونینوں کے میدان میں اچھا تجربہ تھا۔ آگے چل

کر وہ ہندوستان کے صدر جمہوریہ بنے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ کامراج دوسروں کی صلاحیتوں اور کردار کا بہت صحیح اندازہ لگالیا کرتے تھے۔

پرامیسورم ایک ہری جن تھے۔ کامراج نے ان کو منسٹر بنا کر، ہندو ریلیجیس اینڈومنٹ بورڈ کا انچارج بنادیا تھا۔ ہزاروں مندروں کی دیکھ بھال کرنا ان کے فرائض میں شامل تھا۔ کامراج نے ان کو وزیر اس لیے بنایا تھا کہ ان کو شہرت اور عزت ملے۔ اس بات سے ثابت ہوتا ہے کہ کامراج گھٹیا درجہ کی سیاست سے بہت اوپر تھے۔ اور صرف اپنوں کو عہدے دینے کی بات پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ تو بس ایمانداری اور صلاحیت کے قدر دان تھے۔

کامراج نے اپنے مقصد کو ایک سے زیادہ بار یہ کہہ کر واضح کیا تھا "میں اعلان کرتا ہوں کہ عوام میرے دیوتا ہیں۔ وہ کار اور کوٹھی کی مانگ نہیں کرتے۔ ان کو تو صرف روٹی، کپڑا اور مکان چاہیے۔ یہ ہم سب کا فرض ہے کہ ان کی یہ بنیادی ضروریات پوری کریں۔ مہاتما گاندھی کا یہی خواب تھا۔ اس خواب کو سچ کر دکھانے کے لیے ہم سب کو مل کر اور پورے دل سے کام کرنا چاہیے۔"

انھوں نے اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مدراس کی رہنمائی کی۔ اپنے وزیروں کو جو مشورہ دیتے تھے وہ سیدھا سادا، عملی اور فائدہ مند ہوتا تھا۔ "مشکل کا سامنا کرو۔ اس سے بچنے کی کوشش مت کرو۔ مشکل کا حل تلاش کرو چاہے وہ حل معمولی سا ہی ہو۔ اگر آپ لوگ کچھ کام کر کے دکھائیں گے تو عوام مطمئن رہیں گے۔"

اپنے وزیروں کی آزادی میں وہ کبھی دخل نہیں دیتے تھے۔ ان کے سارے وزیر مل جل کر ایک ٹیم کی طرح کام کرتے تھے۔ جب وہ وزیر اعلیٰ تھے تو کوئی بھی ان سے مل سکتا تھا اور وہ سب کی تکلیفوں اور شکایتوں کو دھیان سے سنتے تھے۔ اگر کوئی ان سے اپنی ذات کے لیے کوئی خصوصی فائدہ یا غلط رعایت کی درخواست کرتا تھا تو اس کی بات کبھی نہیں سنتے تھے لیکن صحیح شکایات وہ فوراً دور کر دیتے تھے۔ وہ کبھی کسی سے کوئی وعدہ نہیں کرتے تھے بلکہ بڑی صفائی سے کہہ دیا کرتے تھے۔

'پاتم پار کلام' یعنی دیکھیں گے۔ ان کا نعرہ تھا "باتیں کم کام زیادہ"۔ وہ اس بات میں یقین رکھتے

تھے کہ کسی افسر کا کام خود اس افسر کے بارے میں بتا دیتا ہے۔

انھیں باتوں کی وجہ سے، کامراج تامل ناڈو کے سب سے زیادہ ہر دل عزیز وزیر اعلیٰ رہے۔ آج بھی تامل ناڈو کے لوگ بعد میں آنے والے چیف منسٹروں کے کام کا مقابلہ کامراج کے کاموں سے کرتے ہیں۔

ترقیاتی پروگرام میں کامراج تعلیم کو پہلا درجہ دیتے تھے۔ ان کے زمانہ میں بہت سے نئے اسکول کھلے اور پہلے سے چلے آنے والے اسکولوں میں زیادہ عمارتوں، لیباریٹریوں اور لائبریریوں وغیرہ کی سہولیات دی گئیں۔ ان کے زمانہ میں اسکولوں کی تعداد بھی بڑھی اور ان میں پڑھنے والے طالب علموں کی بھی۔ کوئی گاؤں ایسا باقی نہ بچا تھا جس میں پرائمری اسکول نہ ہو ہر پنچایت یونین کے علاقہ میں ایک ہائی اسکول بن گیا تھا۔ یہ کامراج ہی تھے جنھوں نے گیارہ سال کی عمر تک مفت اور لازمی تعلیم شروع کی اور رفتہ رفتہ میٹریکولیشن تک تعلیم مفت کر دی۔ ہندوستان کے دستور میں سبھی بالغوں کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہے۔ کامراج کی خواہش تھی کہ ملک کے سبھی بچوں کو جلد سے جلد پڑھا لکھا بھی بنادیا جائے۔

جب کامراج دورے پر جاتے تھے تو گاؤں کے علاقہ میں پتلے دبلے، ہڈی کے ڈھانچوں جیسے کمزور بچوں پر ان کی نظر پڑتی تھی۔ وہ سوچا کرتے تھے جب تک عوام کے پیٹ میں روٹی نہ ہو تعلیم کی ترقی اور اصلاح کا کوئی پروگرام کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے انھوں نے اسکولوں میں دوپہر کے کھانے کی انوکھی اسکیم چلائی تھی۔ اس کا مقصد یہی تھا کہ لاکھوں غریب بچوں کو اسکولوں میں دن میں کم سے کم ایک بار تو اچھا اور صحت بخش کھانا مل جایا کرے۔ اس انوکھی اسکیم چلانے کے لیے دنیا کے بہت سے لیڈروں نے کامراج کی تعریف کی تھی اور خواہش ظاہر کی تھی کہ دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی اس طرح کی اسکیمیں چلائی جائیں۔

اسکولوں میں مفت یونیفارم ملنے کی ایک دوسری اسکیم بھی کامراج نے ہی چلائی تھی۔ ایک جیسی یونیفارم کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ذات پات اور اونچے نیچے طبقات کا فرق مٹ جائے اور بچوں کے دماغوں میں ایک دوسرے سے پیار اور میل جول کا جذبہ پیدا ہو۔ ایسا ہونے سے بچے آگے چل کر اچھے شہری بنیں گے اور ایک ایسے ہندوستان کی تعمیر کریں گے جو صحیح

معنوں میں سیکولر ہو۔

کامراج کا خیال تھا کہ ساری قوم کو ملک کی تعمیر میں حصہ لینا چاہیے۔ ترقی کے ہر کام کے لیے لوگوں کو صرف سرکار سے ہی امید نہیں لگائے رکھنی چاہیے بلکہ خود بھی ان کو کچھ محنت کرنی چاہیے۔ کامراج نے 'اسکول امپر وومنٹ کانفرنس' کی بھی ایک بہت اچھی اسکیم بنائی تھی۔

اس اسکیم کے تحت عوام سے اسکولوں کو چلانے اور ان کو بلیک بورڈ، کتابیں، کاپیاں، کاغذ قلم وغیرہ، دوپہر کا کھانا اور اسکول یونیفارم دینے کے لیے مدد لینے کی تجویز تھی۔ سارے تامل ناڈو میں اس قسم کی بہت سی کانفرنسیں ہوئیں اور عوام فوری طور پر مدد دینے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس طرح کامراج نے اپنے صوبہ میں لاکھوں جھونپڑوں میں علم کی شمع روشن کی۔

کھیتی کے میدان میں سینچائی کی بہت سی اسکیمیں مقررہ وقت میں پوری ہوئیں۔ آج بھی ان اسکیموں سے کسانوں کو بہت فائدہ پہنچ رہا ہے۔ زمین کی حد مقرر کرنے کے قانون (لینڈ سیلنگ ایکٹ) اور کاشت کاروں کے تحفظ کے قانون (ٹیننسی پروٹیکشن ایکٹ) بھی اسی زمانہ میں بنائے گئے اور ان کی وجہ سے بے شمار چھوٹے کسانوں اور زمینداروں کی زمین جوتنے والے کاشتکاروں کو فائدہ پہنچا اور انھیں زمینداروں کے ظالم پنجوں سے نجات مل گئی۔ گانووں میں بجلی پہنچانے کے سلسلے میں بھی تامل ناڈو نے پہل کی تھی۔

اقتصادی ترقی کے لیے کامراج ہندوستان میں چین اور جاپان کی طرح ایک مضبوط صنعتی بنیاد قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس سے ہندوستان میں ملنے والے ذرائع اور مقامی لوگوں کے ہنر کا زیادہ سے زیادہ استعمال ہوتا۔ ان کی کابینہ میں شامل صنعت و حرفت کے وزیر آر۔ وینکٹ رمن نے اپنے رہنما کے خواب پورے کر دکھائے۔ صوبہ میں بڑی بڑی صنعتوں کے ساتھ ساتھ درمیانی اور چھوٹے درجہ کی صنعتوں کی خوب ترقی ہوئی۔ جلد ہی تامل ناڈو ملک کے ترقی یافتہ صنعتی صوبوں کی فہرست میں شامل ہو گیا۔

ہر طرح کی ترقی دیکھ کر جواہر لال نہرو نے یہ کہہ کر کامراج کی تعریف کی کہ "حالاں کہ وہ زیادہ انگریزی نہیں جانتے اور اپنا سارا کام تامل زبان میں کرتے ہیں لیکن انھوں نے مدراس کے انتظام کو سارے ہندوستان میں سب سے اچھا بنا دیا ہے۔" حالاں کہ کامراج اس بات کو

پسند نہیں کرتے تھے کہ جو لوگ زندہ ہوں ان کے مجسمے لگائے جائیں لیکن اس کے باوجود نہرو جی نے 1961 میں مدراس میں کامراج کا ایک مجسمہ لگوایا اور بڑی خوشی کے ساتھ اس کی نقاب کشائی کی۔

کامراج نے امیر لوگوں پر ٹیکس لگا کر اپنی اسکیموں کے لیے پیسہ اکھٹا کیا۔ ٹیکس لگانے کے بارے میں ان کے جو خیالات تھے ان کا ذکر کرنا یہاں مناسب ہوگا۔ "اگر ایک ہاتھی کے منہ سے نکل کے تھوڑا سے چارہ زمین پر گر جائے تو اس سے ہاتھی کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا لیکن ہزاروں چیونٹیاں اس گرے ہوئے کھانے سے اپنا پیٹ بھر سکتی ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی آدمی اپنی ضرورت سے زیادہ کماتا ہے اور تھوڑی سی رقم سرکار کو ادا کرتا ہے تو کیا اس رقم سے بھوکے ننگے غریبوں کے آنسو خشک نہیں ہوں گے۔؟"
اس عرصہ میں کامراج کی طاقت کو کسی نے چیلنج نہیں کیا لیکن کبھی انھوں نے بھی اپنی طاقت کو اپنے یا دوسروں کے فائدے کے لیے غلط طریقہ سے استعمال نہیں کیا۔ ان کی ماں کافی بوڑھی ہو چکی تھیں۔ ان کو بھی زندگی کی معمولی آسانیاں فراہم کرنے کے لیے انھوں نے کبھی اپنے اثر کا استعمال نہیں کیا۔ وہ تو ان سے ملنے بھی سال بھر میں ایک دو بار ہی جایا کرتے تھے۔ وہ بڑی سختی سے ایمانداری برتتے تھے اور معاملات میں خود کو الجھاتے نہیں تھے۔ خود اپنی ذات کو آرام پہنچانے کا خیال بھی ان کو نہیں آتا تھا۔ وزیر اعلیٰ بننے کے بعد بھی وہ ہمیشہ کی طرح سیدھا سادا کھانا کھاتے رہے اور معمولی لباس پہنتے رہے۔
حکومت کی طرف سے سیاسی کارکنوں کو زمین یا نقد رقم کی شکل میں تحفے ملا کرتے تھے لیکن کامراج ان چند لوگوں میں سے تھے جو ان تحفوں کو لینے سے انکار کر دیتے تھے لیکن دوسری طرف اگر وہ یہ دیکھتے کہ کسی اچھے سیاسی کارکن کے حالات خراب ہیں تو وہ اس کی ہر طرح سے مدد کرتے تھے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ سیلاب یا قدرتی حادثوں کے شکار غریب لوگوں کی فوری مدد کرنے کے لیے انھوں نے دفتری قاعدوں کی بھی پرواہ نہیں کی۔ ان کا اصول تھا کہ قانون انسان کے لیے ہوتے ہیں انسان قانون کے لیے نہیں ہوتے۔

کامرج پلان

1933 کا سال تھا۔ کامراج کو یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوتا تھا کہ جس کانگریس کو انھوں نے اور

ان کی طرح دوسرے بہت سے بھارت کے سپوتوں نے اپنا خون پسینہ دے کر مضبوط بنایا تھا وہ رفتہ رفتہ کمزور ہوتی جارہی تھی۔ وہ اس بات کو کیسے برداشت کر سکتے تھے؟

کانگریس میں نئی جان ڈالنے کے لیے انھوں نے ایک ماسٹر پلان بنایا اس کی خاص بات یہ تھی کہ زیادہ عمر کے پرانے لوگوں کو اپنے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے کر کانگریس کو پھر سے مضبوط بنانا تھا اور اُسے پرانے آدرشوں کے مطابق ڈھالنا تھا۔ جواہر لال نہرو نے اس منصوبہ کو منظوری دے دی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے بھی اس کو سراہا۔ اس منصوبہ کو "کامراج پلان" کا نام دیا گیا اور مان لیا گیا۔

2/ اکتوبر کو خود کامراج نے وزارت اعلیٰ کے عہدے سے استعفیٰ دے کر پہل کی اور ایک بار پھر سے ثابت کر دیا کہ وہ طاقت کے بھوکے نہیں تھے۔ جواہر لال نہرو نے بھی اپنا استعفیٰ دینے کی پیش کش کی لیکن ملک ان کی رہنمائی سے محروم ہونا نہیں چاہتا تھا اس لیے ان سے اپنے عہدے پر قائم رہنے کی درخواست کی گئی۔ لال بہادر شاستری، جگ جیون رام، مرار جی ڈیسائی اور ایس۔ کے۔ پاٹل جیسے بہت سے ریاستی اور مرکزی وزیر استعفیٰ دے کر پارٹی کے کاموں میں لگ گئے۔

اگلے سال 1946 میں نہرو جی کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اور ساری قوم کو ان کی رہنمائی کی ضرورت کو مد نظر رکھتے ہوئے، کامراج کو آل انڈیا کانگریس کا متفقہ طور پر صدر چن لیا گیا۔ وہ اس عہدے پر کافی عرصہ تک رہے اور ملک کی کشتی کو طوفان سے نکال کر ایک بار پھر ثابت کر دیا کہ وہ ایک جمہوریت پسند اور با عمل انسان ہیں۔

27/ مئی 1964 کو ہندوستان کے معمار جواہر لال نہرو اس دنیا سے سدھار گئے۔ کافی عرصے سے ساری دنیا میں اس سوال پر بحث ہو رہی تھی کہ نہرو کے بعد کون ملک کو سنبھالے گا۔ اب اس سوال کا جواب ملنے کا وقت آ گیا تھا۔ سیاست کا تجربہ رکھنے والے ہر جگہ یہی پیشن گوئیاں کر رہے تھے کہ ہندوستان کا مستقبل اندھیرے میں ہے اور یہاں افراتفری اور بکھراؤ پیدا ہو جائے گا۔ اس موقعہ پر کامراج کی بادشاہ گری کی خصوصیت کام آئی اور انھوں نے صرف چھ دنوں میں اس سنگین مسئلہ کا حل ڈھونڈ لیا۔ کامراج نے پارٹی کے لوگوں کو اس بات

پر آمادہ کرلیا کہ پنڈت نہرو کے بعد لال بہادر شاستری وزیر اعظم بنیں۔ وہ وزیر اعظم بنے اور ہندوستان کے لوگوں نے آرام کی سانس لی۔

لیکن انیس مہینے بعد ملک میں پھر بے ترتیبی پیدا ہو گئی۔ 11 / جنوری 1966 کو تاش قند (روس) میں لال بہادر شاستری کی موت ہو گئی۔ انھوں نے وہاں پاکستان کے جنرل ایوب خاں کے ساتھ امن کے ایک سمجھوتے پر دستخط کیے تھے۔ اس موقع پر وزیر اعظم کے عہدے کے لیے کامراج کا نام تجویز کیا گیا لیکن انھوں نے اس بات کو نہیں مانا۔ ایک بار پھر انھوں نے اپنا بادشاہ گر والا رول ادا کیا اس بار یہ بات کچھ آسان نہیں تھی کیوں کہ مرارجی ڈیسائی میدان میں مقابلے کے لیے موجود تھے۔ اور ان کی حیثیت بھی کافی مضبوط تھی۔ کامراج نے اپنا سب سے اہم پتا سنبھال کر رکھا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اندرا گاندھی کافی اکثریت کے ساتھ الکشن میں کامیاب ہوں اور وزیر اعظم بنیں اور ایسا ہوا بھی۔ اندرا گاندھی کے دوسری بار وزیر اعظم بننے میں بھی کامراج کا ہاتھ رہا۔ 24 / جنوری 1966 کو انھوں نے وزیر اعظم کے عہدے کی قسم لی اور سترہ سال تک ہندوستان کی وزیر اعظم بنی رہیں۔

اپنی سیاسی سوجھ بوجھ اور اپنے قوم پرستی کے رویے کی وجہ سے کامراج دوبار ملک کو تباہی کے غار میں گرنے سے بچایا اور اس بات سے وہ ساری دنیا میں مشہور ہو گئے۔ حالاں کہ وہ اب کسی اہم عہدے پر نہیں تھے، لیکن دنیا کے بہت سے ملکوں نے ان کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دی۔

کامراج تین ہفتہ کے دورے پر روس، مشرقی جرمنی، بلغاریہ، چیکو سلاواکیہ اور یوگو سلادیہ گئے اور دنیا کے بڑے بڑے رہنماؤں سے بات چیت کی۔ اس سے پہلے، جب وہ وزیر اعلیٰ نہیں تھے، سری لنکا اور ملیشیا کے دورے پر بھی گئے تھے۔ وہ جہاں بھی گئے ان کا شاندار استقبال ہوا اور انھوں نے وہاں کے لوگوں کے دل جیت لیے۔

کامراج کو یہ اندیشہ تھا کہ کانگریس کی بنیادیں کمزور ہو رہی ہیں۔ ان کا یہ اندیشہ 1967 میں ہونے والے چوتھے انتخابات کے موقع پر صحیح ثابت ہوا۔ پارٹی کو الکشن میں کوئی خاص

کامیابی نہیں ملی۔ مدراس میں حکومت دراوڑ منیترکزگم (ڈی۔ایم۔کے) کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ یہاں تک کہ کامراج خود بھی اپنے اُس حلقہ میں ہار گئے جہاں سے وہ ہمیشہ الکشن لڑا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی ہار کا بہادری کے ساتھ سامنا کیا اور جو لوگ ان کو تسلی دینے آئے ان کو مشورہ دیا کہ وہ مستقبل میں زیادہ لگن کے ساتھ کام کریں۔

حالاں کہ دو سال بعد ایک ضمنی انتخابات میں وہ ناگر کوئل سے پھر پارلیمنٹ کے ممبر بن گئے لیکن تامل ناڈو میں کانگریس جو بری طرح پٹ چکی تھی دوبارہ سے اپنی پرانی شان حاصل نہیں کر سکی۔

قومی سطح پر ایک اور ناخوشگوار حادثہ ہوا۔ سنجیوا ریڈی لوک سبھا کے اسپیکر تھے۔ اندرا گاندھی نے ہندوستان کے صدر جمہوریہ بننے کے لیے پہلے ان کی سفارش کی تھی لیکن تھوڑے دن بعد ہی انھوں نے ان کی بجائے وی۔وی۔گری کی سفارش کر دی۔ وی۔وی۔گری مقابلہ میں جیت گئے۔ اس بات سے کامراج اور اندرا گاندھی کے درمیان غلط فہمی پیدا ہو گئی اور اس کے نتیجہ میں انڈین نیشنل کانگریس میں ایک سیدھی دراڑ پڑ گئی۔ کانگریس کی چوراسی ویں سال گرہ کے موقع پر اس تنظیم کی یہ غیر معمولی شخصیت اپنی حیثیت کھو چکی تھی۔

پھر بھی انھوں نے امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ انھوں نے تامل ناڈو کا ایک طوفانی دورہ کیا اور جس پارٹی کے لیے انھوں نے ساٹھ سال سے زیادہ عرصہ تک کام کیا تھا اس کو دوبارہ مضبوط کرنے کی کوشش کی لیکن ان کو کامیابی نہیں ملی۔ 1971 کے عام انتخابات میں یہ کڑوا سچ سب کے سامنے آ ہی گیا کہ تامل ناڈو میں ڈی۔ایم۔کے کے مقابلہ میں کانگریس نے اپنی پوزیشن کھو دی ہے۔ حالاں کہ کامراج نے حالات کا مقابلہ بہادری کے ساتھ کیا لیکن ان کی صحت بہت کمزور ہو گئی۔

جون 1975 میں اندرا گاندھی نے جمہوریت کی 'حفاظت' کے لیے امرجنسی کی شکل میں قوم کو 'کڑوی دوا' پلائی۔ پریس پر پابندیاں لگ گئیں، بنیادی حقوق ختم کر دیے گئے، سیاسی لیڈروں کو گرفتار کیا جانے لگا اور بہت سے دوسرے سخت اقدامات کیے جانے لگے کامراج کو یہ صورت حال دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔

12 / اکتوبر 1975 کو سارے ہندوستان کی طرح تامل ناڈو میں بھی گاندھی جینتی منائی جارہی تھی۔ کامراج دوپہر کا کھانا کھا کر سو رہے تھے کہ اچانک ان کی آنکھ کھل گئی۔ ان کو بڑی بے چینی محسوس ہو رہی تھی اور بہت پسینہ آرہا تھا۔ کامراج کے گھر کی دیکھ بھال کرنے والے ویراون نے ڈاکٹر کو بلانے کے لیے ٹیلیفون کر دیا۔ وہ ڈاکٹر کو لینے باہر جانے لگا تو کامراج نے کہا ''ویراون جب تم باہر جاؤ تو لائٹ بند کرتے جانا''۔

اس عظیم شخص کے یہ آخری الفاظ تھے۔ وہ روشنی جس نے لاکھوں غریبوں کی زندگی کو اجالا دیا تھا خود ہی بجھ گئی۔ جب ڈاکٹر پہنچا تو ''مکال تھالائی ور'' یعنی عوام کا لیڈر کہلانے والا ایسی گہری نیند سو چکا تھا جس سے وہ پھر کبھی بیدار نہیں ہو سکتا تھا۔

جلد ہی سارے ملک میں ان کی موت کی خبر پھیل گئی اور ساری قوم ہندوستان کے ایک اور مشہور سپوت کے غم میں ڈوب گئی۔

2 / اکتوبر کے دن کے ساتھ ایک اور عجیب بات جڑ گئی۔ دو اکتوبر مہاتما گاندھی اور لال بہادر شاستری کی پیدائش کا دن تھا۔ یہی دن اپنی سادگی کے لیے مشہور، گاندھی جی کے ایک اور پیرو کی وفات کا بھی دن بن گیا۔

ان کی موت کے بعد 1976 میں ان کو ہندوستان کا سب سے بڑا شہری اعزاز ''بھارت رتن'' دیا گیا۔

کامراج تامل ناڈو تک محدود نہیں رہے تھے۔ وہ اس قسم کے سیاست داں نہیں تھے جو صرف اپنے علاقہ کو ہی سب سے زیادہ اہمیت دیتے۔ ان کا نظریہ ہمیشہ قومیت پسندی کا رہا۔ وہ تو یہ کہتے تھے کہ ''کنیا کماری سے کشمیر تک ہر شخص کو یہ محسوس کرنا چاہیے کہ یہ میرا ملک ہے اور ہم سب ہندوستانی ہیں۔ آپ فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آپ تامل ہیں لیکن آپ کو اس سے بھی زیادہ فخر کے ساتھ یہ بات کہنا چاہیے کہ آپ اول بھی اور آخر بھی ایک ہندوستانی ہیں۔ جب ہندوستان خوش حال ہو گا تو تامل ناڈو خود بخود خوش حال ہو جائے گا۔''